ماہنامہ
اظہار
کراچی
SEPTEMBER 2026

یوم دفاع پاکستان

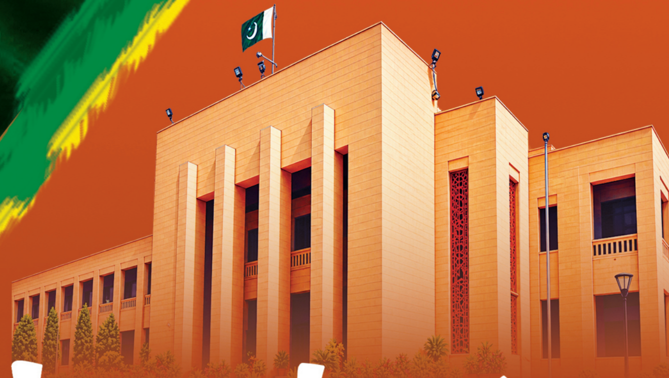

سندھ اسمبلی
جمہوریت اور پاکستان کی محافظ

ایک دھرتی، ایک تاریخ، ایک سندھ
سندھ اسمبلی کی قرارداد متفقہ منظور

- پاکستان ایئر فورس کی پائلٹ مریم مختیار شہید، ایک بیٹی کی قربانی، لاکھوں بیٹیوں کے لیے حوصلہ
- سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ عملدرآمد کی مشکلات اور ان کا حل
- بچوں کے سرطان سے آگاہی کا دن سندھ حکومت کی بہترین کاوشیں اور ترجیحی اقدامات

صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری نے ایوانِ صدر میں چائنا ہاربر انجینئرنگ کمپنی کی جانب سے کیٹی بندر بندرگاہ کی مجوزہ تعمیر و ترقی سے متعلق بریفنگ میں شرکت کی۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ اور دیگر اعلیٰ عہدے داران بھی موجود ہیں۔

صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری سے ملائیشیا کے وزیر داخلہ داتوک سیری سیف الدین ناسوشن بن اسماعیل نے ایوان صدر میں ملاقات کی۔

ماہنامہ
اظہار
کراچی

جلد33، شمارہ09، ستمبر2026ء

نگران اعلیٰ
شرجیل انعام میمن
سینئر وزیر اطلاعات، حکومت سندھ
....
نگران
کاشف گلزار شیخ
سیکریٹری اطلاعات، حکومت سندھ
....
معیز الدین پیرزادہ
ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلشنز
....
مدیر اعلیٰ
غلام سرور سمیجو
ڈائریکٹر انفارمیشن مطبوعات
....
محمد عمران ذوالنون
ڈائریکٹر پی این ڈی
رکن ایڈیٹوریل بورڈ
....
مدیران
ارم ملک
ڈپٹی ڈائریکٹر
......
رقیہ خانم
انفارمیشن آفیسر
......
کمپوزنگ / لے آوٹ / ٹائٹل
ذلفی چاچڑ / سید آفاق شاہ / ذوالفقار حیدر

رابطے کے لئے
ڈائریکٹر مطبوعات
محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ
بلاک 95، سندھ سیکریٹریٹ، B-4 کراچی۔
فون: 021-99202610
www.information.sindh.gov.pk/publications
publication.sid@gmail.com
http://www.facebook.com/publication.sid
http://x.com/Publication_sid

فہرست

• اداریہ	غلام سرور سمیجو	2
1. نعت رسول مقبول ﷺ	محسن نوری	03
2. سندھ: تہذیبوں کا سنگم اور تاریخی ورثے کا خزانہ	یسریٰ سلیم	05
3. سندھ کی وحدت ہماری مشترکہ شناخت ہے	امبر احمد	08
4. پاکستان ایئر فورس کی پائلٹ مریم مختیار شہید ایک بیٹی کی قربانی، لاکھوں بیٹیوں کے لیے حوصلہ	افسانہ بدر	12
5. سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ عملدرآمد کی مشکلات اور ان کا حل	آغا شعیب عباس	15
6. ہزاروں سالہ سندھ کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی یونیسکو میں عالمی پذیرائی	شاہ زیب ریان	18
7. شیخ ایاز وادیٔ مہران کی روایت، مزاحمت اور امید کا لازوال شاعر	محمد سمیع اللہ	21
8. بچوں کے سرطان سے آگاہی کا دن سندھ حکومت کی بہترین کاوشیں اور ترجیحی اقدامات	اطہر بیگ	24
9. سندھ طاس معاہدہ، پاکستان کے آبی حقوق کا مضبوط قانونی حصار	محمد آصف احمد	27
سندھ کی خود مختاری اور میر نصیر خان کا عہد	پروین بلوچ	34
10. لیاری، شیدی ورثے کی پہچان، سندھ کی کثیر الثقافتی روح	محمد سلمان	37
11. عالمی یوم خواندگی سندھ میں تعلیم و شعور کے فروغ کا عزم	سید عامر حسین	40
12. محمد ابراہیم جویو، سندھ کی فکری بیداری، سندھی زبان اور علمی جدوجہد کا روشن استعارہ	سلمان احمد	43
13. سید میر محمد معصوم بکھری سندھ کا مورخ، شاعر اور علمی ورثے کا امین	دیبا پروین	46
I. A Strong Defence for a Peaceful Pakistan Strength, Diplomacy and Regional Stability	*Syed Aamir Hussain*	I
II. A New Era of Sustainable Mobility in Sindh Leading Sindh Towards Modern and Accessible Public Transport	*Yusra Saleem*	IV
III. I Work for Sindh Empowering Sindh's Youth for a Digital Future	*Parveen Baloch*	VII
IV Sindh's Enterprise Development Fund Empowering Youth in Mirpurkhas	*Muhammad Asif Ahmed*	X

ناشر: محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ
پرنٹر: پیکاک پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی-فون: 0300-2152634

سندھ کی وحدت اور جمہوری مکالمہ

سندھ کی سیاسی تاریخ میں صوبے کی وحدت کا سوال ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سندھ ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی خطہ ہے، جس کی شناخت اس کی جغرافیائی وحدت، مشترکہ تاریخ اور قدیمی ثقافتی روایات سے تشکیل پاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً انتظامی ڈھانچے، اختیارات کی تقسیم اور شہری و دیہی علاقوں کے مسائل کے حوالے سے مختلف آرا سامنے آتی رہی ہیں، لیکن ان معاملات پر گفتگو کا جمہوری اور آئینی دائرے میں رہنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اسی تناظر میں سندھ اسمبلی میں سندھ کی تقسیم کے خلاف پیش کی جانے والی قرارداد قابلِ توجہ ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کے صدر نثار احمد کھوڑو کی جانب سے پیش کردہ قرارداد سندھ اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کی۔ قرارداد کی متفقہ منظوری اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ ایوان میں موجود مختلف سیاسی قوتوں نے اس مخصوص معاملے پر مشترکہ مؤقف اختیار کیا۔

تاہم کسی بھی پارلیمانی قرارداد کی اہمیت کو اس کے وسیع تر سیاسی اور سماجی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ سندھ کی وحدت کے ساتھ ساتھ صوبے کے مختلف علاقوں میں موجود انتظامی، معاشی، شہری سہولتوں، وسائل کی تقسیم، روزگار، تعلیم، صحت اور بلدیاتی اختیارات جیسے مسائل بھی عوامی بحث کا حصہ ہیں۔ ان مسائل پر مؤثر اور قابلِ عمل پالیسی تشکیل دینا صوبائی حکومت، سیاسی جماعتوں اور منتخب نمائندوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

سندھ اسمبلی کی متفقہ قرارداد بہرحال ایک اہم پارلیمانی پیش رفت ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ موجودہ منتخب ایوان نے سندھ کی موجودہ صوبائی وحدت کے تسلسل کے حق میں متفقہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ سندھ ایک تھا، ایک ہے اور ایک رہے گا۔

غلام سرور سمیجو
ڈائریکٹر مطبوعات
محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ

نعمت رسول مقبول صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم

محسن نوری

خیر البشر خیر الوریٰ　　ختمِ رُسل صلِّ علیٰ
شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ　　طٰہٰ مزمل صلِّ علیٰ
لولاک کا تجھ سے خطاب　　تیری ثنا خواں رب کی کتاب
تاریک تھا سارا جہاں　　تجھ سے قبلَ صلِّ علیٰ
پیشِ ظہورِ آدم نبی　　سے ہے نبوت انکو ملی
رحمت عالمِ نعمت خدا　　اوّل آخر صلِّ علیٰ
چشمِ صدیق بھی چاہیے　　روئے نبی دیکھنے کے لیے
یا ہو عمر، عثمان علی　　یہ ہیں اہل صلِّ علیٰ
عرب و عجم شاہِ امم　　تیری کھائیں خیرات ہم
در در پہ زاری کیونکر کرے　　تیرا سائل صلِّ علیٰ
اقصیٰ ہو یا غارِ حرا　　سب کو شرف ان سے ملا
قرآن یوں گویا ہوا　　رحمت اصل صلِّ علیٰ

یوسف بھی ہے جن پہ شیدا   رب نے کیا نہ اُن سا پیدا
انسان کیا حیوان بھی   گائے بلبل صلِّ علیٰ
بچپن کے اک معجزات میں   لکھا ہے دیکھو مِشکواۃ میں
جہاں بھی گئے خاتم نبی   تابع بادل صلِّ علیٰ
حاجت روا خدا ہی سہی   خدا کا بھیجا ہے نبی بھی وہی
پل میں کرے مشکل کو حل   منتِ محل صلِّ علیٰ
ناکارہ تم نہ پھرتے رہو   ذکرِ نبی کرتے ہو
دَھنِ بخود شیریں بُکن   قل اَنتَ قل صلِّ علیٰ
شہِ انبیاء یا مجتبیٰ   سلام علیکم یا مصطفیٰ
دیدم نہ شُد پیدا کسے   تیرا مثل صلِّ علیٰ
فرمودہ اند ربِ جلیل   بحقِ محمد حضرت خلیل
نار نمی سوزد بَتو   کہ درتو نسل صلِّ علیٰ
ہوں متبلائے مرضِ نہاں   آیا ہوں درپہ طبیب جہاں
پژمردہ لایا ہوں میں   افسُردہ دل صلِّ علیٰ
نَطَقَ الحَجَر شَقَّ القَمَر   جھک کر سلامی کرتے شجر
یا ربِّ مِن جانبِ مَن   سَلَّم و صلّ صلِّ علیٰ
دل میں میری ہے خواہش یہی   بِسنَو خدایا مَکْن مَرتَہی
دم توڑدوں یہ کہتے ہوئے   بوقتِ اجل صلِّ علیٰ
ہر حال ہے شامل مجھے اسکے   عنایتِ نبی کامل مجھے
توسُّط میں نے محسن   لکھی غزل صلِّ علیٰ

سندھ تہذیبوں کا سنگم اور تاریخی ورثے کا خزانہ

یسریٰ سلیم

برصغیر کی تاریخ میں مغلیہ دور ایک ایسا عہد ہے جس نے سیاست، ثقافت، ادب، فنونِ لطیفہ اور خصوصاً فنِ تعمیر پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔ مغلیہ فنِ تعمیر محض اینٹ، پتھر، سنگِ مرمر اور گنبد و مینار کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسی تہذیبی روایت کی عکاسی کرتا ہے جس میں اسلامی، فارسی، وسط ایشیائی، ترک اور مقامی برصغیری روایات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئیں۔ اس دور میں تعمیر ہونے والی عمارتیں آج بھی پاکستان کی تاریخی شناخت، فنکارانہ عظمت اور تہذیبی ورثے کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ مغلیہ حکمرانوں نے فنِ تعمیر کو ریاستی شان و شوکت کے اظہار کے ساتھ ساتھ تہذیبی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بھی بنایا۔ بادشاہ اکبر کے دور میں تعمیرات میں وسعت، مضبوطی اور مقامی طرزِ تعمیر کے عناصر نمایاں ہوئے، جبکہ جہانگیر اور شاہجہاں کے ادوار میں جمالیات، نفاست اور تزئین و آرائش کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ شاہجہاں کے دور کو بالخصوص مغلیہ فنِ تعمیر کا سنہری دور قرار دیا جاتا ہے، جب سنگِ مرمر، نفیس نقش و نگار، خطاطی، گنبدوں، محرابوں اور متناسب ڈیزائن نے تعمیراتی فن کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

پاکستان آج بھی اس عظیم ورثے کا امین ہے۔ لاہور، ملتان، پشاور، اسلام آباد کے گرد و نواح اور بالخصوص سندھ کے تاریخی شہر ٹھٹھہ میں مغلیہ عہد اور اس سے متاثرہ تعمیرات کے شاندار نمونے موجود ہیں۔ ان تاریخی عمارتوں میں صرف ایک دور کی تعمیراتی مہارت ہی نہیں بلکہ صدیوں پر محیط تہذیبی میل جول، علمی سرگرمیوں اور معاشرتی زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

پاکستان کے ثقافتی ورثے کا ذکر سندھ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ سندھ وہ خطہ ہے جہاں ہزاروں سال سے تہذیبیں پروان چڑھتی رہی ہیں۔ موئن جو دڑو سے لے کر کوٹ ڈیجی، بھنبھور، ٹھٹھہ اور مکلی تک سندھ کی سرزمین انسانی تہذیب کے مختلف ادوار کی گواہی دیتی ہے۔ یہاں اسلامی، مقامی، فارسی اور وسط ایشیائی اثرات نے ایک منفرد ثقافتی شناخت کو جنم دیا۔

خصوصاً ٹھٹھہ سندھ کے تاریخی ورثے میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ شہر ایک زمانے میں علم، تجارت، تہذیب اور فنون کا اہم مرکز تھا۔ ٹھٹھہ اور اس کے گرد و نواح میں موجود تاریخی مساجد، مقابر اور دیگر تعمیراتی آثار آج بھی اس خطے کی عظمتِ رفتہ کا پتا دیتے ہیں۔ شاہجہاں مسجد اور مکلی کا تاریخی قبرستان سندھ کے

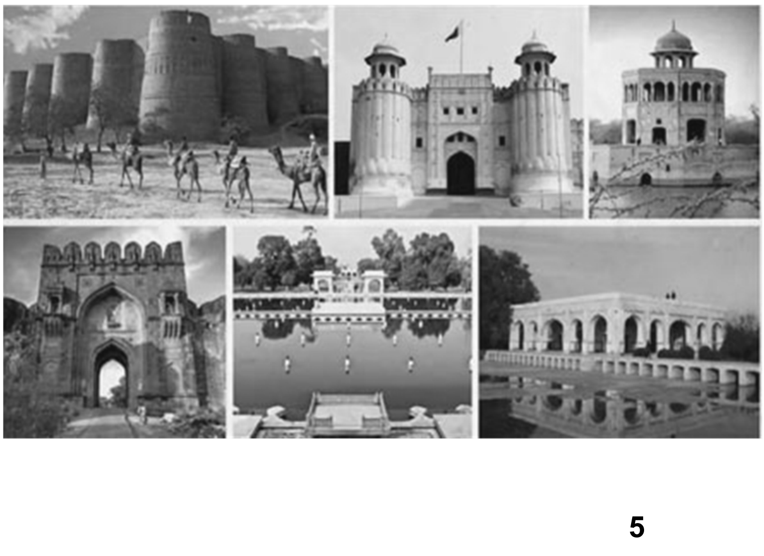

تعمیراتی ورثے کی دو ایسی نمایاں مثالیں ہیں جو ملکی اور عالمی سطح پر غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔

- **شاہجہاں مسجد ٹھٹھہ: فنِ تعمیر کا شاہکار**

ٹھٹھہ کی شاہجہاں مسجد مغلیہ فنِ تعمیر کا ایک منفرد اور شاندار نمونہ ہے۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور میں تعمیر ہونے والی یہ مسجد اپنی خوبصورت محرابوں، گنبدوں، اینٹوں کی نفیس کاریگری اور صوتی خصوصیات کے باعث منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس مسجد کی سب سے نمایاں خصوصیات میں اس کے خوبصورت گنبد اور محرابی ساخت شامل ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں مقامی طرزِ تعمیر اور مغلیہ فن کے امتزاج نے اسے ایک الگ شناخت عطا کی۔ اس عمارت کی سادگی میں جو جمال پایا جاتا ہے وہ اسے دیگر شاہی عمارتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ شاہجہاں مسجد اس بات کی بھی علامت ہے کہ مغلیہ دور میں تعمیراتی روایت صرف دارالحکومتوں تک محدود نہیں تھی بلکہ سندھ جیسے تاریخی خطوں میں بھی فنونِ تعمیر کی سرپرستی کی گئی۔ آج یہ مسجد سندھ کی تاریخی شناخت اور پاکستان کے ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ ہے۔

- **مکلی: پتھروں میں محفوظ صدیوں کی تاریخ**

ٹھٹھہ کے قریب مکلی کا تاریخی قبرستان دنیا کے عظیم تاریخی قبرستانوں میں شمار ہوتا ہے۔ وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے اس قبرستان میں مختلف ادوار کے حکمرانوں، صوفیا، علما، امرا اور دیگر اہم شخصیات کے مقابر موجود ہیں۔ ان مقابر پر کی گئی سنگ تراشی اور نقش و نگار سندھ کی غیر معمولی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔

مکلی صرف قبروں کا ایک وسیع سلسلہ نہیں بلکہ یہ سندھ کی سیاسی، مذہبی اور سماجی تاریخ کی ایک کھلی کتاب ہے۔ یہاں موجود تعمیرات میں اسلامی فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ مقامی فنی روایات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ پتھر پر کندہ کاری، جیومیٹریائی اشکال، خطاطی اور تعمیراتی تناسب اس خطے کے ہنرمندوں کی غیر معمولی صلاحیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مکلی اور ٹھٹھہ کی تاریخی اہمیت سندھ کے عوام کے لیے باعثِ فخر ہے۔ یہ مقامات نئی نسل کو اپنے ماضی سے جوڑنے، تاریخی شعور پیدا کرنے اور ثقافتی شناخت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

- **لاہور کا شاہی قلعہ اور شالامار باغ**

مغلیہ فنِ تعمیر کی بات ہو اور لاہور کا ذکر نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ لاہور کا شاہی قلعہ مغلیہ دور کی عظمت کا ایک نمایاں نشان ہے۔ اس کے مختلف حصوں میں مختلف ادوار کی تعمیرات شامل ہیں، تاہم مغلیہ حکمرانوں نے اسے ایک شاندار شاہی کمپلیکس میں تبدیل کیا۔ شاہی قلعے کے محلات، دیوان، محرابیں، آئینے کا کام، نقش و نگار اور دیگر تعمیراتی عناصر مغلیہ دربار کی شان و شوکت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح شالامار باغ مغلیہ باغبانی اور تعمیراتی منصوبہ بندی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ پانی کے بہاؤ، فواروں، باغیچوں، راستوں اور عمارتوں کی ترتیب میں ایک خاص تناسب اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ لاہور کا یہ تاریخی ورثہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی تہذیبی ورثے کا حصہ ہے۔ شاہی قلعہ اور شالامار باغ کو 1981ء میں یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل کیا گیا، جس سے ان مقامات کی عالمی اہمیت مزید اجاگر ہوئی۔

- **بادشاہی مسجد: عظمت اور روحانیت کا امتزاج**

لاہور کی بادشاہی مسجد مغلیہ دور کی عظیم مذہبی تعمیرات میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی وسیع و عریض عمارت، بلند مینار، عظیم الشان گنبد اور سرخ پتھر کی تعمیر اسے دور سے ہی ایک منفرد شناخت عطا کرتی ہے۔ بادشاہی مسجد کی تعمیر اس دور کی انجینئرنگ اور تعمیراتی مہارت کا ثبوت ہے۔ اس کی وسیع نماز گاہ اور کشادہ صحن اجتماعی عبادت کے تصور کو سامنے رکھتے ہیں۔ مسجد آج بھی مذہبی اور تاریخی دونوں اعتبار سے ایک اہم مقام رکھتی ہے اور پاکستان آنے والے سیاحوں کے لیے ایک نمایاں کشش ہے۔

- **مغلیہ ورثہ اور یونیسکو کا عالمی اعتراف**

پاکستان کے تاریخی مقامات میں متعدد ایسے آثار موجود ہیں جنہیں عالمی سطح پر غیر معمولی ثقافتی اہمیت حاصل ہے۔ لاہور کا شاہی

قلعہ اور شالامار باغ 1981ء میں یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ ٹھٹھہ کے تاریخی آثار بھی عالمی ورثے کے تناظر میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ شاہجہاں مسجد، مکلی اور سندھ کے دیگر تاریخی مقامات اس بات کی علامت ہیں کہ پاکستان کا ثقافتی ورثہ صرف چند بڑے شہروں تک محدود نہیں بلکہ ملک کے مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ سندھ بالخصوص ایک ایسا خطہ ہے جہاں مختلف تہذیبوں اور ادوار کے آثار ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عالمی پذیرائی پاکستان کے لیے اعزاز ہونے کے ساتھ ایک بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ تاریخی عمارتوں کی حفاظت، مناسب دیکھ بھال، ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی خدمات، جدید سائنسی طریقوں سے بحالی اور سیاحوں کے لیے بہتر سہولتوں کی فراہمی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

- **سندھ حکومت اور ثقافتی ورثے کا تحفظ**

سندھ حکومت کے لیے صوبے کے تاریخی، ثقافتی اور صوفی ورثے کا تحفظ ایک اہم ذمہ داری ہے۔ سندھ کی شناخت صرف اس کے تاریخی مقامات سے نہیں بلکہ اس کی زبانوں، لوک روایات، صوفیانہ فکر، موسیقی، دستکاری، روایتی فنون اور قدیم تہذیبی مراکز سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ ٹھٹھہ، مکلی، بھنبھور، موئن جو دڑو، کوٹ ڈیجی اور دیگر تاریخی مقامات سندھ کے لیے ثقافتی اثاثہ ہیں۔ ان مقامات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ انہیں تعلیمی اور سیاحتی سرگرمیوں سے منسلک کیا جائے تو نوجوان نسل اپنے ماضی سے زیادہ بہتر انداز میں واقف ہو سکتی ہے۔ سندھ کے ثقافتی ورثے کی ترقی میں مقامی آبادی کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ تاریخی مقامات کے اطراف رہنے والے لوگوں کو ثقافتی سیاحت، گائیڈ سروسز، دستکاری، مقامی مصنوعات اور دیگر مثبت معاشی سرگرمیوں سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اس طرح ورثے کا تحفظ صرف سرکاری ذمہ داری نہیں رہے گا بلکہ مقامی معاشرہ بھی اس عمل کا فعال حصہ بن سکے گا۔

- **ثقافتی ورثہ: نئی نسل کے لیے امانت**

تاریخی عمارتیں دراصل قوموں کی اجتماعی یادداشت ہوتی ہیں۔ ان میں گزرے ہوئے زمانوں کی داستانیں، معاشرتی اقدار، فنون اور انسانی تخلیقی صلاحیتیں محفوظ ہوتی ہیں۔ اگر ہم اپنے تاریخی ورثے کو نظر انداز کریں گے تو آنے والی نسلیں اپنے ماضی کے ایک اہم حصے سے محروم ہو جائیں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں پاکستان کے ثقافتی ورثے کے بارے میں شعور اجاگر کیا جائے۔ طلبہ کے لیے تاریخی مقامات کے مطالعاتی دورے، عجائب گھروں اور آثارِ قدیمہ کے مراکز سے تعلیمی روابط اور ڈیجیٹل ذرائع سے تاریخی ورثے کی دستاویز بندی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ سندھ کے نوجوانوں کو خاص طور پر اپنے صوبے کے تاریخی ورثے سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ شاہجہاں مسجد، مکلی، موئن جو دڑو، بھنبھور اور دیگر مقامات محض سیاحتی مقامات نہیں بلکہ سندھ اور پاکستان کی شناخت کے بنیادی ستون ہیں۔ مغلیہ فنِ تعمیر پاکستان کی تاریخ اور ثقافت کا ایک روشن باب ہے۔ لاہور کے شاہی قلعے، شالامار باغ اور بادشاہی مسجد سے لے کر سندھ کی شاہجہاں مسجد اور مکلی کے عظیم تاریخی آثار تک، یہ تمام مقامات ہماری تہذیبی عظمت اور فنی صلاحیتوں کی زندہ علامتیں ہیں۔ سندھ بالخصوص پاکستان کے ثقافتی منظرنامے میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس سرزمین نے ہزاروں سال پر محیط تہذیبوں، صوفی روایات، فنون اور تعمیراتی شاہکاروں کو اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔ ٹھٹھہ اور مکلی اس تاریخی تسلسل کی ایسی مثالیں ہیں جو نہ صرف سندھ بلکہ پورے پاکستان کی شناخت کو عالمی سطح پر اجاگر کرتی ہیں۔ ہم اپنے تاریخی ورثے کو صرف ماضی کی یادگار سمجھنے کے بجائے مستقبل کی تعمیر کا وسیلہ بنائیں۔ مؤثر تحفظ، تحقیق، بحالی، ثقافتی سیاحت اور عوامی شعور کے ذریعے پاکستان خصوصاً سندھ کے تاریخی مقامات کو عالمی ثقافتی اور سیاحتی نقشے پر مزید نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ورثہ ہمارے آباؤ اجداد کی تخلیقی صلاحیتوں کی امانت ہے۔ اسے محفوظ رکھنا ہماری قومی ذمہ داری بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی ہے۔

■

سندھ کی وحدت ہماری مشترکہ شناخت ہے

امبر احمد

سندھ کی وحدت کا تصور محض نقشے پر کھینچی ہوئی ایک جغرافیائی لکیر کا نام نہیں۔ یہ دریائے سندھ کے کناروں پر ہزاروں برس سے پروان چڑھنے والی تہذیب، صوفی روایت، زبانوں، ثقافتوں، شہروں اور دیہات، صحراؤں اور ساحلوں، قدیم بستیوں اور جدید شہری مراکز کے باہمی رشتے کا نام ہے۔ موئن جو دڑو سے کراچی تک، تھر سے کشمور تک اور بدین سے جیکب آباد تک سندھ ایک ایسی اجتماعی شناخت رکھتا ہے جس میں مختلف رنگ، زبانیں، عقیدے اور ثقافتی روایات ایک وسیع تہذیبی دائرے میں سمٹ آتی ہیں۔

یہی وہ پہلو ہے جسے سندھ کے سینئر وزیر شرجیل انعام میمن نے سندھ اسمبلی میں اپنے خطاب کے دوران نمایاں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے تنوع کی سب سے خوبصورت مثال سندھ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کراچی میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، جبکہ سندھ اسمبلی خود پاکستان کے کثیر الثقافتی مزاج کی عکاس ہے جہاں سندھی، اردو، پنجابی، پشتو، بلوچی اور دیگر زبانیں بولنے والے نمائندے موجود ہیں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اراکین بھی جمہوری عمل کا حصہ ہیں۔

سندھ اسمبلی میں وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ اور سینئر وزیر شرجیل انعام میمن کے خطابات نے ایک بار پھر اس بنیادی حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ سندھ کی وحدت محض ایک انتظامی یا سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ تاریخ، تہذیب، شناخت، باہمی احترام اور اجتماعی احساس کا معاملہ ہے۔ سندھ کی تقسیم کے حوالے سے سامنے آنے والی مختلف آرا کے جواب میں وزیراعلیٰ سندھ کا یہ واضح مؤقف کہ سندھ کی وحدت کے معاملے پر دوہرا معیار یا دوہرا موقف قبول نہیں کیا جاسکتا، ایک ایسے احساس کی ترجمانی کرتا ہے جو سندھ کے عوام کے اجتماعی شعور میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نئے صوبوں کا فیصلہ ٹیلی ویژن پروگراموں یا سیاسی بیانات کے ذریعے نہیں بلکہ آئینی اور پارلیمانی طریقہ کار کے تحت اسمبلیوں میں ہونا چاہیے، جبکہ سندھ کی تقسیم کے خلاف سندھ اسمبلی ماضی میں متعدد مرتبہ قراردادیں منظور کرچکی ہے۔

سندھ کے سینئر وزیر شرجیل انعام میمن نے بھی اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری ریڈ لائن ہے اور پاکستان کی آئینی و قانونی حیثیت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ کی تاریخ پاکستان کی تاریخ سے جدا نہیں۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں سندھ نے اہم کردار ادا کیا، سندھ اسمبلی برصغیر کی تاریخ میں وہ پہلی قانون ساز اسمبلی تھی جس نے پاکستان کے قیام کے حق میں قرارداد منظور کی۔

یہ حقیقت سندھ کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے کہ یہاں شناخت کسی ایک رنگ تک محدود نہیں۔ سندھی ہونا صرف سندھی زبان بولنے کا نام نہیں بلکہ اس سرزمین کی تاریخ، ثقافت، رواداری اور مشترکہ زندگی سے تعلق رکھنے کا نام ہے۔ اسی طرح کراچی کا شہری ہونا کسی ایک زبان یا قومیت کی شناخت میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ کراچی نے دہائیوں سے پاکستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کو اپنے اندر جگہ دی ہے۔ یہاں اردو، سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، ہندکو، گجراتی اور دیگر زبانیں بولنے والے شہری اپنے اپنے ثقافتی رنگ کے ساتھ آباد ہیں۔ مختلف مذاہب کے پیروکار بھی اس شہر اور صوبے کی اجتماعی زندگی کا حصہ ہیں۔ یہی تنوع کراچی کو محض ایک میٹروپولیٹن شہر نہیں بلکہ پاکستان کے کثیر الثقافتی چہرے کی علامت بناتا ہے۔

سندھ کی وحدت کا دفاع کسی زبان یا قومیت کے خلاف نہیں بلکہ سندھ کے مشترکہ وجود کے حق میں ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ وحدت کے تصور کو کسی ایک لسانی گروہ یا سیاسی جماعت کی ملکیت نہ بنایا جائے۔ سندھ میں رہنے والا ہر شہری، خواہ وہ سندھی بولتا ہو یا اردو، پنجابی، پشتو یا بلوچی، خواہ اس کا خاندانی تعلق پاکستان کے کسی دوسرے خطے سے ہو، سندھ کی معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے سندھ کی وحدت کا سوال بھی تمام شہریوں کے باہمی اعتماد، احترام اور مشترکہ مستقبل سے وابستہ ہونا چاہیے۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کا یہ کہنا کہ سندھ کی وحدت کے معاملے پر دوہرا موقف قبول نہیں کیا جاسکتا، اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ سیاسی اختلاف جمہوریت کا لازمی حصہ ہے۔ مختلف جماعتوں کے اپنے منشور، ترجیحات اور سیاسی نقطۂ نظر ہوسکتے ہیں، لیکن صوبے کی آئینی حیثیت، پاکستان کی سالمیت اور شہریوں کے بنیادی حقوق کے معاملات میں واضح اور ذمہ دارانہ مؤقف ضروری ہے۔ نئے صوبوں یا انتظامی اکائیوں کا مسئلہ ایک سنجیدہ آئینی معاملہ ہے، جسے جذباتی نعروں یا ٹیلی ویژن مباحثوں کے بجائے آئین، پارلیمان، متعلقہ اسمبلیوں اور عوامی رائے کے جمہوری اصولوں کے تحت دیکھا جانا چاہیے۔

سندھ کے سینئر وزیر شرجیل انعام میمن نے بھی اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری ریڈ لائن ہے اور پاکستان کی آئینی و قانونی حیثیت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مؤقف سندھ کی شناخت کو پاکستان کی قومی وحدت سے الگ کرنے کے بجائے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ سندھ کی تاریخ پاکستان کی تاریخ سے جدا نہیں۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں سندھ نے اہم کردار ادا کیا، سندھ اسمبلی برصغیر کی تاریخ میں وہ پہلی قانون ساز اسمبلی تھی جس نے پاکستان کے قیام کے حق میں قرارداد منظور کی۔ قائداعظم محمد علی جناح کا تعلق بھی سندھ سے تھا اور کراچی پاکستان کے پہلے دارالحکومت کی حیثیت سے ملک کی

ابتدائی تاریخ میں مرکزی مقام رکھتا تھا۔

اس تاریخی پس منظر میں سندھ کی شناخت اور پاکستان سے وابستگی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ سندھ اپنی ہزاروں سالہ تہذیبی شناخت پر فخر کرتے ہوئے پاکستان کی وفاقی وحدت کا مضبوط حصہ رہ سکتا ہے۔ پاکستان کی خوبصورتی بھی یہی ہے کہ اس کی وفاقی شناخت مختلف صوبائی، لسانی، ثقافتی اور علاقائی شناختوں کے احترام سے تشکیل پاتی ہے۔ ایک مضبوط پاکستان وہی ہو سکتا ہے جہاں صوبے اپنی ثقافتی شناخت محفوظ رکھتے ہوئے قومی وحدت میں اپنا کردار ادا کریں۔

سندھ کی تاریخ میں صوفیا نے اس تصور کو عملی شکل دی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری میں انسان کو انسان سے جوڑنے کا پیغام دیا۔ سچل سرمست نے مذہبی اور لسانی تنگ نظری سے بلند ہو کر محبت، رواداری اور انسانی وحدت کی بات کی۔ لال شہباز قلندر کے مزار پر صدیوں سے مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف علاقوں سے آنے والے اور مختلف مذہبی پس منظر رکھنے والے لوگ عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ یہ سندھ کی روح کا وہ پہلو ہے جس میں دروازے بند نہیں بلکہ کھلے رہتے ہیں۔

شاہ لطیف کی دھرتی پر ماروی کا کردار وطن سے محبت کی علامت ہے۔ ماروی کے لیے اپنے وطن کی مٹی، اپنے لوگ اور اپنی شناخت دنیا کی آسائشوں سے زیادہ قیمتی تھے۔ سندھ کی وحدت کے جذبات میں بھی یہی تعلق نظر آتا ہے۔ یہ صرف سیاسی نقشے کا مسئلہ نہیں بلکہ ان لوگوں کے احساسات کا معاملہ ہے جن کی زندگی، روزگار، زبان، ثقافت، یادیں، رشتے اور آباؤاجداد اسی سرزمین سے وابستہ ہیں۔

سندھ کے شہریوں کے لیے کراچی اور اندرونِ سندھ کے درمیان تعلق بھی اسی وسیع وحدت کا حصہ ہے۔ کراچی سندھ کی معاشی شہ رگ ہے، بندرگاہ، صنعت، تجارت، تعلیم، صحت، میڈیا، ٹیکنالوجی اور روزگار کے بڑے مراکز یہاں قائم ہیں۔ دوسری طرف اندرونِ سندھ کی زرعی معیشت، دریائے سندھ، بیراج، نہری نظام، تاریخی شہر، صوفی مراکز اور دیہی آبادی سندھ کی مجموعی معیشت اور تہذیب میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنے کے بجائے ایک مربوط معاشی اور انتظامی نظام کے طور پر دیکھنا سندھ کے مستقبل کے لیے زیادہ مفید ہے۔ سندھ کی وحدت کے تحفظ کا مطلب یہ بھی ہے کہ صوبے کے ہر شہری کو برابر کے حقوق اور مواقع فراہم کیے جائیں۔ اگر کوئی شہری محرومی محسوس کرتا ہے تو اس محرومی کا جواب تقسیم نہیں بلکہ بہتر حکمرانی، منصفانہ وسائل کی تقسیم، روزگار، تعلیم، صحت، بلدیاتی سہولیات اور قانون کی بالادستی میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ شہریوں کے مسائل حقیقی ہوں تو ان کا حل بھی حقیقی اور عملی ہونا چاہیے۔ سیاسی اختلاف کو دشمنی میں بدلنے کے بجائے اسے جمہوری مکالمے کا ذریعہ بنانا ضروری ہے۔ کراچی کے حوالے سے یہ ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ دنیا کے بڑے شہروں کی طرح کراچی بھی مسلسل بدل رہا ہے۔ مختلف علاقوں، زبانوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد اس شہر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ اس شہر کی طاقت اس کے تنوع میں ہے۔ اگر یہی تنوع باہمی احترام کے ساتھ برقرار رہے تو کراچی سندھ اور پاکستان دونوں کے لیے معاشی اور ثقافتی ترقی کا سب سے بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

سندھ اسمبلی میں مختلف زبانوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے نمائندوں کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ جمہوری ادارے تنوع کو جگہ دیتے ہیں۔ اسمبلی کا ایوان دراصل پورے صوبے کی نمائندگی کا آئینی فورم ہے۔ یہاں اختلاف بھی ہونا چاہیے، بحث بھی ہونی چاہیے اور مختلف آرا بھی سامنے آنی چاہئیں، لیکن ہر بحث کا اختتام آئین، قانون اور جمہوری اصولوں کی پاسداری پر ہونا چاہیے۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ اور سینئر وزیر اطلاعات شرجیل انعام میمن کے خطابات کا مشترکہ پیغام اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ سندھ کی وحدت اور پاکستان کی وحدت کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنا درست نہیں۔ سندھ اپنی شناخت کے ساتھ پاکستان کا حصہ ہے اور پاکستان کی وفاقی وحدت سندھ کی تاریخی، ثقافتی اور آئینی حیثیت کے احترام سے مزید مضبوط ہوتی

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کا یہ کہنا کہ سندھ کی وحدت کے معاملے پر دوہرا موقف قبول نہیں کیا جاسکتا، اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ نئے صوبوں یا انتظامی اکائیوں کا مسئلہ ایک سنجیدہ آئینی معاملہ ہے، جسے جذباتی نعروں یا ٹیلی ویژن مباحثوں کے بجائے آئین، پارلیمان، متعلقہ اسمبلیوں اور عوامی رائے کے جمہوری اصولوں کے تحت دیکھا جانا چاہیے۔

ہے۔ پاکستان کی سلامتی اور سندھ کی شناخت دونوں کو تحفظ دینا ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ایک دوسرے کو تقویت دینے والا عمل ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ سندھ کے نوجوانوں کو تقسیم کے نعروں کے بجائے تعلیم، روزگار، تحقیق، ٹیکنالوجی اور ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ انہیں بتایا جائے کہ ان کی اصل طاقت ان کی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کا علم، کردار اور صلاحیت ہے۔ سندھ کے مستقبل کا فیصلہ نفرت نہیں بلکہ تعلیم، برداشت، جمہوریت، معاشی ترقی اور قانون کی حکمرانی کرے گی۔

سندھ کی مٹی نے ہمیشہ مختلف لوگوں کو اپنے اندر جگہ دی ہے۔ دریائے سندھ کی روانی کی طرح اس کی تہذیب بھی مختلف دھاروں کو اپنے اندر جذب کر کے آگے بڑھتی رہی ہے۔ یہی سندھ کی اصل انفرادیت ہے۔ یہاں وحدت کا مطلب یکسانیت نہیں بلکہ تنوع کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے رہنا ہے۔ ایک ہی باغ میں مختلف رنگوں کے پھول اپنی الگ خوشبو رکھتے ہوئے باغ کی خوبصورتی بڑھاتے ہیں؛ سندھ بھی مختلف زبانوں، ثقافتوں، عقیدوں اور قومیتوں کے اسی خوبصورت امتزاج کا نام ہے۔

اس لیے سندھ کی وحدت کا عہد کسی ایک طبقے، جماعت یا زبان کا عہد نہیں ہونا چاہیے بلکہ سندھ میں بسنے والے ہر شہری کا مشترکہ عہد ہونا چاہیے۔ سندھی ہو یا اردو بولنے والا، پنجابی ہو یا پشتون، بلوچ ہو یا کوئی اور، مسلمان ہو، ہندو ہو، عیسائی ہو یا کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو، سب سندھ کے اجتماعی وجود کا حصہ ہیں۔ سندھ کی وحدت اسی وقت حقیقی معنوں میں مضبوط ہوگی جب ہر شہری خود کو محفوظ، باعزت، برابر اور اس سرزمین کا حصہ محسوس کرے۔

یہی وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ اور سینئر وزیر شرجیل انعام میمن کے خطابات کا بنیادی احساس بھی ہے کہ پاکستان کی سالمیت، آئینی حیثیت اور خودمختاری ناقابلِ سمجھوتہ ہیں اور سندھ کی شناخت و وحدت بھی عوام کے اجتماعی احساس کا اہم حصہ ہے۔ سندھ کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کے شہروں اور دیہات، اس کی مختلف قومیتوں اور زبانوں، اس کے نوجوانوں اور بزرگوں، اس کے ساحل اور صحرا، اس کے ماضی اور مستقبل کو ایک مشترکہ ترقیاتی خواب میں جوڑنے کی ضرورت ہے۔

سندھ صرف ایک صوبہ نہیں، ایک تہذیبی احساس ہے؛ صرف ایک جغرافیہ نہیں، ایک تاریخی حافظہ ہے؛ صرف ایک سیاسی اکائی نہیں، کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، رشتوں اور خوابوں کا نام ہے۔ اس وحدت کی حفاظت نفرت سے نہیں، محبت سے؛ تعصب سے نہیں، رواداری سے؛ تقسیم سے نہیں، انصاف سے؛ اور نعروں سے نہیں، جمہوری عمل، آئین اور بہتر حکمرانی سے ممکن ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو سندھ کی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے پاکستان کی قومی وحدت کو مزید مضبوط کر سکتا ہے۔

■

پاکستان ایئر فورس کی پائلٹ مریم مختیار شہید
ایک بیٹی کی قربانی، لاکھوں بیٹیوں کے لیے حوصلہ

افسانہ بدر

قوموں کی تاریخ میں بعض شخصیات اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والی نسلوں کے لیے عزم، حوصلے اور قربانی کی علامت بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی باہمت پاکستانی بیٹی مریم مختیار شہید تھیں، جنہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی اور عظیم قربانی سے یہ ثابت کیا کہ بلند پرواز خواب دیکھنے والی خواتین کے لیے آسمان کی وسعتیں محدود نہیں۔ ان کی داستان صرف پاک فضائیہ کی ایک بہادر افسر کی داستان نہیں بلکہ پاکستان کی ان تمام بیٹیوں کے عزم کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنے ملک، اپنے خاندان اور اپنے مستقبل کے لیے مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

24 نومبر 2015ء پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا دن ہے جسے قوم مریم مختیار شہید کی قربانی کے حوالے سے یاد رکھتی ہے۔ اس روز وہ اپنے انسٹرکٹر پائلٹ اسکواڈرن لیڈر ثاقب عباسی کے ہمراہ FT-7PG تربیتی طیارے میں معمول کی تربیتی پرواز پر تھیں۔ میانوالی کے قریب کندیاں کے علاقے میں طیارے کو فنی خرابی کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں پائلٹس نے ایجیکشن کیا، تاہم مریم مختیار کو شدید چوٹیں آئیں اور وہ بعد ازاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ ان کی شہادت نے پوری قوم کو سوگوار کر دیا، لیکن ساتھ ہی ان کا نام پاکستان کی ان بہادر خواتین کی صف میں شامل ہو گیا جنہوں نے قومی ذمہ داری کی ادائیگی میں اپنی جان قربان کی۔ مریم مختیار کی سبز ہلالی پرچم میں لپٹی میت کو سی-130 طیارے کے ذریعے میانوالی ایئر بیس سے کراچی لایا گیا۔ ملیر کینٹ میں انہیں مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کی آخری رسومات میں عسکری قیادت، سرکاری حکام، اہل خانہ اور شہریوں نے شرکت کی۔ ان کی قربانی کو قومی سطح پر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور انہیں تمغۂ بسالت سے بھی نوازا گیا۔ مریم مختیار کا نام اس لیے بھی تاریخ میں نمایاں ہے کہ وہ پاکستان ایئر فورس کی ان خواتین پائلٹس میں شامل تھیں جنہوں نے فضائی تربیت کے انتہائی مشکل اور حساس شعبے میں اپنی صلاحیت ثابت کی اور فرائض کی انجام دہی کے دوران شہادت پائی۔

مریم کی زندگی اس حقیقت کا عملی ثبوت تھی کہ کامیابی کا

تعلق جنس سے نہیں بلکہ قابلیت، محنت، نظم وضبط اور عزم سے ہوتا ہے۔ ایک لڑکی جب اپنے خواب کو مقصد بنا لیتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل محنت کرتی ہے تو وہ ان تمام رکاوٹوں کو عبور کر سکتی ہے جو بظاہر اس کے راستے میں ناقابلِ عبور نظر آتی ہیں۔ مریم نے بھی ایک ایسا شعبہ منتخب کیا جہاں جسمانی، ذہنی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا غیر معمولی امتحان ہوتا ہے۔ آسمانوں پر پرواز کرنا محض ایک خواب نہیں بلکہ سخت تربیت، مسلسل مشق، غیر معمولی توجہ اور فیصلہ سازی کی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ انہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنی قابلیت سے ثابت کیا کہ پاکستانی خواتین کسی بھی مشکل میدان میں اپنا مقام بنا سکتی ہیں۔ مضبوط پروں والی خواتین سے مراد صرف وہ خواتین نہیں جو طیارے اڑاتی ہیں۔ مضبوط پر دراصل مضبوط ارادے کی علامت ہیں۔ وہ خواتین جن کے حوصلے مشکلات سے نہیں ٹوٹتے، جو ناکامی کو اختتام نہیں بلکہ دوبارہ کوشش کا آغاز سمجھتی ہیں، جو اپنے خاندان اور معاشرے کے لیے مثبت کردار ادا کرتی ہیں اور جو علم، محنت اور کردار کو اپنی طاقت بناتی ہیں، وہی حقیقی معنوں میں مضبوط پروں والی خواتین ہیں۔

پاکستانی خواتین نے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ تعلیم کے میدان میں طالبات اور اساتذہ نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ طب کے شعبے میں خواتین ڈاکٹرز اور نرسز انسانی خدمت کی مثالیں قائم کر رہی ہیں۔ انجینئرنگ، سائنس، ٹیکنالوجی، قانون، صحافت، کاروبار، کھیل، انتظامیہ اور دفاع سمیت مختلف شعبوں میں پاکستانی خواتین مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ کامیابیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ جب خواتین کو تعلیم، تربیت اور مساوی مواقع میسر آئیں تو وہ نہ صرف اپنی زندگی بدل سکتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کی ترقی میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ پاکستان ایئر فورس میں خواتین کی شمولیت بھی اسی مثبت تبدیلی کی ایک اہم مثال ہے۔ خواتین نے پائلٹنگ، ایوی ایشن انجینئرنگ، میڈیکل سروسز، ایئر ڈیفنس، تعلیم اور دیگر شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں انجام دی ہیں۔ جدید دنیا میں فضائی قوت صرف جنگی طیارے اڑانے تک محدود نہیں بلکہ اس میں ایرو اسپیس، جدید ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت، ایوی ایشن انجینئرنگ، کمیونیکیشن، سائبر ٹیکنالوجی اور دفاعی تحقیق جیسے متعدد شعبے شامل ہیں۔ ان تمام میدانوں میں خواتین کے لیے نئے مواقع پیدا ہو رہے ہیں اور پاکستانی بیٹیاں اپنی صلاحیتوں کے ذریعے ان مواقع سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ مریم مختیار شہید کی قربانی اس وسیع سفر میں ایک روشن سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی داستان آج کی طالبات کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنے خوابوں کو محدود نہ کریں۔ اگر ایک بیٹی پائلٹ بننا چاہتی ہے تو اسے آسمان کی طرف دیکھنے کا حق ہے؛ اگر وہ سائنس دان بننا چاہتی ہے تو اسے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے کا حق ہے؛ اگر وہ انجینئر، ڈاکٹر، استاد، صحافی، کاروباری شخصیت یا کسی قومی ادارے کی افسر بننا چاہتی ہے تو اسے اپنی صلاحیت ثابت کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس سلسلے میں خاندان کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک بیٹی کی پہلی حوصلہ افزائی اس کے گھر سے ہوتی ہے۔ والدین جب اپنی بیٹیوں کو تعلیم حاصل کرنے، سوال پوچھنے، اپنی صلاحیتیں دریافت کرنے اور اپنے مستقبل کے فیصلوں میں اعتماد دیتے ہیں تو وہ دراصل ایک مضبوط نسل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ طالبات کو ایسا ماحول فراہم کریں جہاں وہ اعتماد کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔ ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ میرٹ، تعلیم، تربیت اور مواقع کے دروازے خواتین کے لیے کھلے رکھے جائیں۔

آج کی دنیا تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ ٹیکنالوجی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے اور مستقبل کی معیشت ان لوگوں کی ہوگی جو علم، تحقیق، تخلیقی سوچ اور جدید مہارتوں سے آراستہ ہوں گے۔ اس نئے دور میں خواتین کی شرکت محض صنفی مساوات کا سوال نہیں بلکہ قومی ترقی کی ضرورت بھی ہے۔ اگر ملک کی نصف آبادی اپنی صلاحیتوں کے بھرپور اظہار سے محروم رہے تو قومی ترقی کی رفتار بھی محدود ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب خواتین تعلیم اور روزگار کے مواقع سے فائدہ اٹھاتی ہیں تو خاندان مضبوط ہوتا ہے،

معیشت میں بہتری آتی ہے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ مریم مختیار شہید کی زندگی ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ قومی خدمت ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ وطن سے محبت صرف الفاظ میں نہیں بلکہ کردار اور عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی سپاہی سرحد پر ملک کی حفاظت کرتا ہے، کوئی ڈاکٹر مریض کی جان بچاتا ہے، کوئی استاد نئی نسل کی تربیت کرتا ہے، کوئی سائنس دان نئی دریافت کے ذریعے ملک کو آگے بڑھاتا ہے اور کوئی صحافی معاشرے کو معلومات فراہم کرتا ہے۔ ہر شعبے میں خدمت کی اپنی اہمیت ہے۔ مریم نے اپنے حصے کی قومی ذمہ داری آسمانوں پر انجام دی اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔

شہادت ایک ایسا مقام ہے جسے الفاظ میں مکمل طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مریم مختیار کے اہل خانہ کے لیے ان کی جدائی یقیناً ایک ایسا غم ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ لیکن قوموں کی تاریخ میں بعض قربانیاں اجتماعی حوصلے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مریم کی قربانی بھی ایسی ہی قربانی ہے جسے پاکستان کی بیٹیاں اپنے لیے ایک حوصلہ سمجھتی ہیں۔ ان کا نام یہ پیغام دیتا ہے کہ مشکلات کے باوجود اپنے مقصد پر قائم رہنے والے لوگ تاریخ میں زندہ رہتے ہیں۔ آج جب پاکستان کی نوجوان نسل اپنے مستقبل کے خواب دیکھ رہی ہے تو مریم مختیار شہید کی داستان ان خوابوں کو حوصلہ دیتی ہے۔ یہ داستان کہتی ہے کہ منزل مشکل ہو سکتی ہے مگر ناممکن نہیں؛ راستہ طویل ہو سکتا ہے مگر سفر ترک نہیں کرنا چاہیے؛ حالات سخت ہو سکتے ہیں مگر ارادہ مضبوط ہو تو انسان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔

مضبوط پروں والی خواتین وہی ہیں جو طوفانوں سے گھبرا کر پرواز ترک نہیں کرتیں۔ ان کی طاقت صرف ان کے پروں میں نہیں بلکہ ان کے عزم میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کے لیے روشنی، اپنے معاشرے کے لیے مثال اور اپنی قوم کے لیے امید بن جاتی ہیں۔ ایک باہمت ماں اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوار سکتی ہے، ایک استاد نسلوں کی سوچ بدل سکتی ہے، ایک ڈاکٹر انسانوں کی جان بچا سکتی ہے، ایک سائنس دان نئی دنیا کی بنیاد رکھ سکتی ہے اور ایک پائلٹ آسمانوں کو اپنی منزل بنا سکتی ہے۔ مریم مختیار شہید نے اپنی مختصر مگر باوقار زندگی سے یہی سبق دیا کہ خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے حوصلہ ضروری ہے اور قومی خدمت کے لیے کردار۔ ان کی قربانی پاکستان کی بیٹیوں کے لیے ایک روشن چراغ ہے جو انہیں مشکلات کے اندھیروں میں راستہ دکھاتا رہے گا۔

پاکستان کی خواتین کے پر مضبوط ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انہیں تعلیم، اعتماد، مواقع اور آگے بڑھنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جائے۔ جب ایک بیٹی اپنے خواب کے لیے پر پھیلاتی ہے تو وہ صرف اپنی منزل کی طرف نہیں اڑتی بلکہ اپنے خاندان، معاشرے اور قوم کو بھی ترقی کی نئی بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ مریم مختیار شہید کی یاد میں یہی سب سے خوبصورت خراجِ عقیدت ہوگا کہ پاکستان کی ہر بیٹی کو اپنے خواب دیکھنے، انہیں حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ملک و قوم کی خدمت کرنے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ وہ خواتین جو عزم کو اپنی طاقت، علم کو اپنا راستہ اور کردار کو اپنی پہچان بناتی ہیں، ان کے لیے آسمان بھی ایک حد نہیں بلکہ ایک آغاز ہے۔ مضبوط اڑان بھرنے والی یہ بیٹیاں ہی پاکستان کے روشن مستقبل کی بلند ترین پرواز ہیں۔■

سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ۔
عملدرآمد کی مشکلات اور ان کا حل

آغا شعیب عباس

بچپن کی شادی یا کم سنی کی شادی ایک ایسی معاشرتی روایت ہے جو نہ صرف بچے کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالتی ہے بلکہ اس کی جسمانی، نفسیاتی اور تعلیمی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق کم سنی میں شادی سے حمل اور ولادت کے جسمانی اور نفسیاتی صحت پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق کم عمر لڑکیوں کو درپیش اہم طبی نقصانات ہوتے ہیں۔ جن میں 15 سال سے کم عمر لڑکیوں میں حاملہ ہونے کے دوران یا بچے کی پیدائش کے وقت فوت ہونے کا امکان 20 سال سے زائد عمر کی خواتین کے مقابلے میں دوگنا زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف کم عمر لڑکیوں کو خود بڑھتی ہوئی عمر میں جسم کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وہ ایک اور انسان کو غذا فراہم کرے لہٰذا اس کی وجہ سے پیچیدہ زچگی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتی عمر میں جسم کو خود غذائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دوران حمل ٹھہرنے سے لڑکی کا جسم شدید غذائی قلت اور آئرن کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق کم عمری میں حمل کے دوران بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھنے اور دورے پڑنے کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے نیز وقت سے پہلے پیدائش کم سن ماؤں کے ہاں بچے اکثر نو ماہ پورے ہونے سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کا وزن پیدائش کے وقت نارمل سے بہت کم ہوتا ہے جس سے ان کی بقا کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ایسے بچوں میں غذائی قلت، انفیکشن اور پیدائش کے بعد ابتدائی دنوں میں فوت ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ زبردستی یا ناپختہ عمر میں اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے سے لڑکی شدید ذہنی دباؤ، انزائٹی (Anxiety) کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔

سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی میں ایک بچی کا کیس 2022ء میں پاکستان کے نمایاں قانونی اور میڈیا کیسز میں شامل رہا۔ یہ معاملہ آن لائن گیمنگ کے ذریعے دوستی، نابالغی میں پسند کی شادی اور اغوا کی قانونی جنگ کے گرد گھومتا ہے۔ 14 سالہ بچی کراچی کے ایک علاقے سے پراسرار طور پر غائب ہوئی، جس پر اس کے والد نے اغوا کی ایف آئی آر درج کروائی۔ چند دنوں بعد پنجاب سے بچی کی تصویر اور ویڈیو بیان سامنے آیا، جس میں اس نے لاہور کے رہائشی سے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا دعویٰ کیا۔ بچی کے

والدین اور ان کے وکیل کا موقف تھا کہ نادرا (NADRA) ریکارڈ کے مطابق لڑکی کی عمر 14 سال ہے لہذا یہ سندھ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ کے تحت کم سنی کی شادی اور اغوا کا کیس ہے۔ بعد میں عدالت نے بچی کو چائلڈ پروٹیکشن ہوم بھیجا اور والدین کی سرپرستی دی گئی۔ آن لائن گیمز اور سوشل میڈیا کے ذریعے پنجاب اور سندھ کے مختلف شہروں میں کم عمر بچوں کے گھر سے نکلنے اور نکاح کرنے کے متعدد کیسز شامل ہیں جن میں چائلڈ میرج ایکٹ کا سہارا لیا گیا۔ یہ تو وہ کیس ہیں جو رپورٹ ہوئے ہیں ایسے ہی انگنت کیس ہیں جو رپورٹ ہی نہیں ہوتے۔ یہی حال اندرون سندھ کا بھی ہے جہاں ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔

پاکستان میں بالخصوص اور دنیا بھر میں بالعموم اس قبیح رسم کی روک تھام کے لیے مختلف قانونی اور معاشرتی اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں صوبہ سندھ نے ایک تاریخی پیش رفت کرتے ہوئے 2014 میں "سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ" (Sindh Early Child Marriage Restraint Act 2013) منظور کیا۔ اس قانون کا بنیادی مقصد 18 سال سے کم عمر بچوں کی شادی کو قانوناً جرم قرار دینا اور اس کے ذمہ داران کو سزا کے دائرے میں لانا ہے۔ اگرچہ یہ قانون اپنے متن اور مقاصد کے لحاظ سے ایک انتہائی ترقی پسندانہ اور انقلابی قدم ہے لیکن اس کے نافذ ہونے کے سالوں بعد بھی سندھ کے دیہی اور شہری علاقوں میں کم سنی کی شادیوں کا سلسلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکا ہے۔ قانون کی موجودگی کے باوجود اس کے عملدرآمد میں متعدد انتظامی، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نرمی، معاشرتی اور مروجہ روایتی مشکلات حائل ہیں۔

دیکھا جائے تو سندھ اسمبلی کا یہ قانون دیگر صوبوں کے مقابلے میں اس لیے ممتاز ہے کہ اس میں شادی کے لیے لڑکا اور لڑکی دونوں کی کم از کم عمر 18 سال مقرر کی ہے جبکہ ملک کے دیگر حصوں میں چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929 کے تحت لڑکی کی عمر 16 سال مقرر تھی۔ سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 2013 کی اہم خصوصیات میں عمر کی حد 18 سال سے کم عمر کسی بھی فرد یعنی لڑکا یا لڑکی کو بچہ شمار کیا جائے گا اور اس عمر سے قبل شادی کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت کم سنی کی شادی ایک ناقابلِ ضمانت اور قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم ہے یعنی پولیس بغیر وارنٹ کے ملزمان کو گرفتار کر سکتی ہے۔ عدالتی اختیار، فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اطلاع ملنے پر شادی کی تقریب کو روکنے کے لیے حکم جاری کرے۔ سندھ حکومت نے اس عمل کی روک تھام کے لیے ایک جامع حکمتِ عملی کے تحت ایک ہیلپ لائن اور فوری ردِ عمل کا نظام کا ایک منفرد اور فعال چائلڈ پروٹیکشن ہیلپ لائن (جیسے 1121) کو دیہی سطح تک مضبوط کیا ہے۔ جس کے تحت شکایت موصول ہوتے ہی ڈسٹرکٹ چائلڈ پروٹیکشن آفیسرز اور مقامی پولیس پابند ہوتا ہے کہ وہ فوری طور پر موقع پر پہنچ کر شادی رکوانے کے لیے ابتدائی اقدامات کرے۔

اس حوالے سے سندھ حکومت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی ادارہ یونیسف (UNICEF) بھی چائلڈ پروٹیکشن پروگرام میں تعاون کر رہا ہے۔ صوبائی حکومت کا ادارہ "سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی" اور سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ مل کر بچوں کو تشدد، استحصال اور کم سنی کی شادی سے بچانے کے لیے کام رہا ہے۔ واضح رہے کہ سندھ کے دیہی علاقوں میں یونیسف کا فیلڈ ورک قوانین کی تیاری میں "سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 2013" اور "سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ" کی منظوری اور اس کے ضوابط ترتیب دینے میں کلیدی قانونی اور تکنیکی مدد فراہم کی ہے نیز سندھ میں بچوں پر ہونے والے تشدد اور چائلڈ میرج کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے مانیٹرنگ سسٹم قائم کرنے میں مدد کی تاکہ ٹھوس پالیسیاں بنائی جا سکیں۔ یونیسف کی مدد سے سندھ کے مختلف اضلاع جیسے کراچی، حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ اور دادو میں ڈسٹرکٹ چائلڈ پروٹیکشن یونٹس قائم کیے گئے ہیں۔ یہ یونٹس متاثرہ بچوں کو فوری قانونی مدد، نفسیاتی کونسلنگ اور محفوظ پناہ گاہوں تک رسائی فراہم کرتے ہیں۔

سندھ حکومت اور بین الاقوامی اداروں کے ساتھ ساتھ علماء کرام کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خطبات کے ذریعے عوام کو یہ باور کروا سکتے ہیں کہ کم عمری میں بیٹیوں کی شادی کر کے ان کی صحت کو خطرے میں ڈالنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ معاشرے میں دین کے نام پر پھیلی غلط فہمیوں کو دور کرنا کہ اسلام تشدد یا معصوم بچوں پر بوجھ ڈالنے کی حمایت نہیں کرتا، بلکہ ان کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ اپنے خطبوں میں بتائیں کہ اسلام میں بچوں کے حقوق، ان کی دیکھ بھال اور ان کی درست عمر و تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بچپن کی شادی اور بچوں کے تحفظ کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا پہلو انتہائی واضح اور متوازن ہے۔ اسلام لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کی یکساں تعلیم اور تربیت پر زور دیتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق نکاح کے صحیح ہونے کے لیے صرف جسمانی بلوغت ہی کافی نہیں بلکہ عقل، شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔ نکاح میں بلوغت اور شعور کی شرط اسلام میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی آزادانہ رضامندی بنیادی شرط ہے۔ ایک ناپختہ ذہن کا بچہ یا بچی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں اور اس کے نتائج کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کم سنی کی شادی سے لڑکی کی صحت، جان اور آنے والی نسل کو جو شدید جسمانی و نفسیاتی نقصان پہنچتا ہے اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ۔جب علمائے کرام اور طبی ماہرین اس بات پر متفق ہوں کہ 18 سال سے کم عمر میں شادی لڑکی کی صحت اور حیات کے لیے نقصان دہ ہے تو ریاست کا اس پر پابندی لگانا شریعت کے مقاصد کے بالکل مطابق ہے۔ کم سنی کی شادی کے خاتمے کے لیے اسلامی مفکرین اور علمائے کرام کا کردار کلیدی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سندھی ثقافت اور صوفیانہ روایات کو بیدارئ شعور کے لیے استعمال کیا جائے۔ سندھ ہزاروں سال پرانی وادیٔ سندھ کی تہذیب کا وارث اور شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور لال شہباز قلندر کی زمین ہے۔ صوفی فکر میں عورت کو عزت، احترام اور مرکزی مقام حاصل ہے۔ صوفیانہ شاعری مظلوم کی حمایت اور جبر کے خلاف سبق دیتی ہے۔ سندھی سماج میں "اوطاق" (بیٹھک) اور برادری کا نظام بہت مضبوط ہے۔ اگر اس اجتماعی ثقافت کو متحرک کیا جائے تو برادری کے معززین خود کم سنی کی شادیوں کو روک سکتے ہیں۔ ملاکھڑا، بھٹائی کے عرس اور ثقافتی میلوں میں قصہ گو ڈراموں کے ذریعے کم سنی کی شادی کے نقصانات اجاگر کیے جاسکتے ہیں۔ اوطاقوں میں چائلڈ پروٹیکشن اور قانون سے متعلق بات چیت کو روایتی بحث کا حصہ بنایا جائے اور یہ پیغام دیا جائے کہ بیٹی کو پڑھانا اور 18 سال کے بعد شادی کرنا ہی اصل سندھی غیرت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ کی صوفیانہ روایات اور خاندانی اقدار اس مسئلے کا بہترین حل بھی فراہم کرتی ہیں۔ مہمان نوازی اور اجتماعی تحفظ سندھی سماج میں برادری اور محلہ کا نظام بہت مضبوط ہے۔ اگر اس اجتماعی ثقافت کو بچوں کی حفاظت کے لیے متحرک کیا جائے تو برادری کے معززین خود کم سنی کی شادیوں کو روکنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسی روایتی سندھی گھرانوں میں ماں اور سلیقے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیٹی کو گھر کی "عزت" اور "رحمت" سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح دیکھ بھال اور پرورش ثقافتی قدروں کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہر یونین کونسل میں مقامی معززین، ویمن رائٹس ایکٹیوسٹس اور اساتذہ پر مشتمل "چائلڈ پروٹیکشن کمیٹیاں" تشکیل دی جاسکتی ہیں جو اپنے علاقے میں ہونے والی ممکنہ کم سنی کی شادیوں پر نظر رکھیں اور انتظامیہ کو بروقت اطلاع دیں۔

سندھ ارلی چائلڈ ہڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ ایک بہترین اور وقت کی اہم ضرورت کے مطابق بنایا گیا قانون ہے، لیکن یہ اس وقت تک اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتا جب تک ریاست، انتظامیہ اور معاشرہ مل کر اس کی پاسداری نہ کریں۔ کم سنی کی شادی محض ایک قانونی خلاف ورزی نہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کی صحت، تعلیم اور مستقبل پر حملہ ہے۔ قانون پر سختی سے عملدرآمد، پیدائش کی مکمل رجسٹریشن، لڑکیوں کو تعلیم کی فراہمی اور معاشی و سماجی شعور کی بیداری کے ذریعے ہی ہم سندھ اور پاکستان کے بچوں کو ایک محفوظ، صحت مند اور روشن مستقبل دے سکتے ہیں۔

■

ہزاروں سالہ سندھ کی تاریخ،
تہذیب اور ثقافت کی یونیسکو میں عالمی پذیرائی

شاہ زیب ریان

یونیسکو کی عالمی شناخت، ہزاروں سالہ تاریخ اور سندھ حکومت کی ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے کاوشیں

سندھ محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ ہزاروں سال پر محیط انسانی تہذیب، علم، فن، تجارت، صوفی روایت اور ثقافتی تنوع کی ایک زندہ تاریخ ہے۔ دریائے سندھ کے کناروں پر پروان چڑھنے والی تہذیب نے انسانی معاشرے کی ترقی کے ابتدائی ادوار میں جو نقوش چھوڑے، وہ آج بھی دنیا بھر کے لیے حیرت، تحقیق اور فخر کا باعث ہیں۔ سندھ کے تاریخی قلعے، قدیم شہر، مقبرے، مساجد، مزارات، آثارِ قدیمہ، روایتی دستکاریاں، موسیقی، صوفی روایت اور زبان و ادب اس خطے کی منفرد شناخت کو تشکیل دیتے ہیں۔

سندھ کے ثقافتی ورثے کی عالمی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبے کے متعدد تاریخی مقامات کو عالمی سطح پر غیر معمولی ثقافتی اہمیت حاصل ہے۔ یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں سندھ کے موئن جو دڑو اور مکلی، ٹھٹھہ جیسے تاریخی مقامات شامل ہیں، جو سندھ کی قدیم تہذیبی عظمت کے عالمی اعتراف کی علامت ہیں۔ یہ مقامات نہ صرف پاکستان بلکہ پوری انسانیت کے مشترکہ ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں۔

موئن جو دڑو سندھ کی تہذیبی شناخت کا سب سے روشن استعارہ ہے۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل دریائے سندھ کی تہذیب میں آباد ہونے والا یہ قدیم شہر شہری منصوبہ بندی، نکاسئ آب، تعمیرات، دستکاری اور سماجی نظم و ضبط کے حوالے سے غیر معمولی ترقی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے کشادہ راستے، منظم رہائشی علاقے، نکاسئ آب کا نظام، عظیم حمام اور دیگر تعمیراتی آثار اس بات کا ثبوت ہیں کہ قدیم سندھ کے باشندوں نے شہری زندگی کے ایسے اصول وضع کیے تھے جن میں صفائی، منصوبہ بندی اور اجتماعی ضروریات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

موئن جو دڑو کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنے ماضی سے جوڑنے کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب کی مشترکہ ترقی کی داستان بھی سناتا ہے۔ اس مقام سے ملنے والی مہریں، مٹی کے برتن، زیورات، مجسمے اور دیگر آثار اس دور کے لوگوں کی معاشرت، تجارت، فنون اور طرزِ زندگی کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے موئن جو دڑو صرف ایک آثارِ قدیمہ کا مقام نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر کا ایک اہم باب ہے۔

سندھ کا ایک اور عظیم تاریخی ورثہ مکلی کا تاریخی قبرستان ہے،

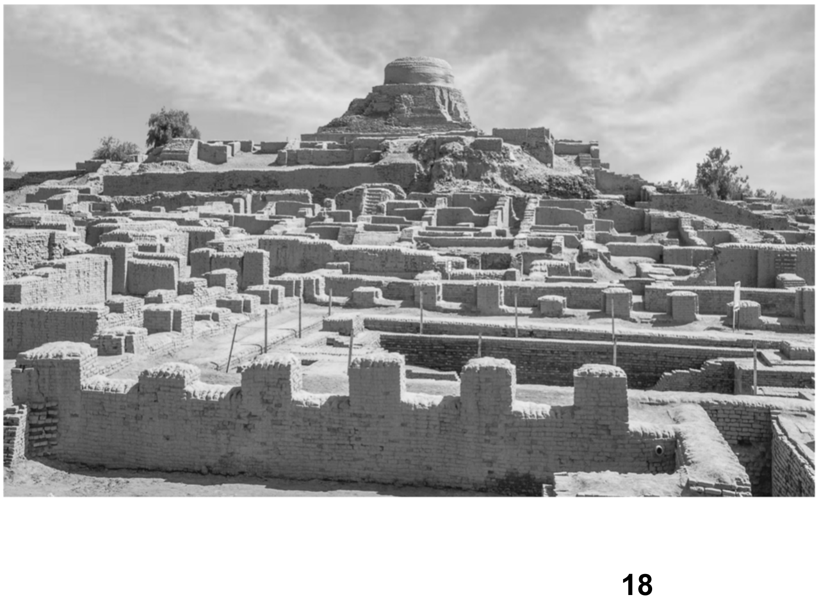

جو ٹھٹھہ کے قریب واقع ہے۔ مکلی دنیا کے بڑے تاریخی قبرستانوں میں شمار ہوتا ہے اور یہاں صدیوں کے دوران تعمیر ہونے والے مقابر، مزارات اور یادگاری عمارتیں سندھ کی فنِ تعمیر، خطاطی اور سنگ تراشی کی غیر معمولی روایت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مکلی کے مقابر پر کندہ نقش و نگار، جیومیٹریائی ڈیزائن، خطاطی اور تعمیراتی اسلوب سندھ کے فنکاروں اور معماروں کی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ مکلی دراصل سندھ کی سیاسی، مذہبی اور سماجی تاریخ کا ایک خاموش مگر جامع دستاویز ہے۔ یہاں حکمرانوں، صوفیا، علما، سپہ سالاروں اور دیگر اہم شخصیات کے مقابر موجود ہیں۔ ہر مقبرہ اپنے اندر ایک الگ داستان رکھتا ہے اور مجموعی طور پر مکلی سندھ کی تہذیبی تاریخ کے کئی ادوار کو ایک ہی مقام پر محفوظ کرتا ہے۔ یونیسکو کی عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں مکلی کی شمولیت اس کے غیر معمولی عالمی ثقافتی مقام کی واضح علامت ہے۔

ٹھٹھہ خود بھی سندھ کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں موجود شاہجہانی مسجد مغلیہ دور کے فنِ تعمیر کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ مسجد کے وسیع صحن، خوبصورت گنبد، محرابیں اور منفرد صوتی خصوصیات اس دور کے معماروں کی فنی مہارت کو ظاہر کرتی ہیں۔ نیلے اور فیروزی رنگ کی ٹائلوں سے مزین یہ مسجد سندھ کے مقامی تعمیراتی ذوق اور وسطی ایشیائی و مغلیہ فنِ تعمیر کے حسین امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔

سندھ کے تاریخی ورثے میں کوٹ ڈیجی قلعہ بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔ خیرپور کے قریب واقع یہ قلعہ سندھ کی قدیم دفاعی تاریخ کا اہم نشان ہے۔ کوٹ ڈیجی کے آثار سندھ میں قدیم شہری تہذیب کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے میں بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس علاقے کی آثارِ قدیمہ کی دریافتوں نے اس تصور کو تقویت دی کہ سندھ میں شہری زندگی اور منظم معاشرت موئن جو دڑو سے بھی پہلے مختلف شکلوں میں موجود تھی۔ اسی طرح رنی کوٹ قلعہ سندھ کے منفرد تاریخی مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی وسیع فصیلوں، قدرتی پہاڑی منظرنامے اور دفاعی ساخت کے باعث رنی کوٹ نہ صرف تاریخی بلکہ جغرافیائی اور سیاحتی اعتبار سے بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے اکثر دنیا کے بڑے قلعہ بند احاطوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا پھیلا ہوا دفاعی نظام اس خطے کی عسکری تاریخ اور تعمیراتی صلاحیتوں کی یاد دلاتا ہے۔

سندھ کا ثقافتی ورثہ صرف پتھروں، عمارتوں اور آثارِ قدیمہ تک محدود نہیں۔ سندھ کی اصل روح اس کے زندہ ثقافتی ورثے میں بھی موجود ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور لال شہباز قلندر جیسے صوفی بزرگوں کی تعلیمات نے سندھ کی سماجی اور ثقافتی شناخت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ محبت، رواداری، انسان دوستی، امن اور روحانی وابستگی پر مبنی صوفی روایت آج بھی سندھ کے معاشرتی مزاج کا اہم حصہ ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام سندھ کی زبان، موسیقی اور ثقافتی شعور کا ایک عظیم خزانہ ہے۔ ان کی شاعری میں سندھ کے صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں، دیہات، عورتوں، محنت کشوں اور عام انسانوں کی زندگی کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ سسی پنہوں، مومل رانو، عمر ماروی اور دیگر لوک داستانیں محض عشقیہ داستانیں نہیں بلکہ سندھ کی اجتماعی یادداشت، مزاحمت، وفاداری اور انسانی وقار کی

علامتیں ہیں۔ سندھ کی ثقافتی شناخت میں اجرک اور سندھی ٹوپی بھی نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اجرک کے پیچیدہ ڈیزائن اور مخصوص رنگ صدیوں پرانی دستکاری کی روایت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک لباس یا چادر نہیں بلکہ سندھ کی شناخت، مہمان نوازی اور ثقافتی فخر کی علامت ہے۔ اسی طرح سندھی ٹوپی، رلی، کھیس، کاشی کاری، لکڑی کا کام، مٹی کے برتن اور دیگر روایتی دستکاریاں سندھ کے زندہ ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں۔

سندھ کے تاریخی ورثے کی اہمیت سیاحت اور معیشت کے حوالے سے بھی غیر معمولی ہے۔ دنیا بھر میں ثقافتی سیاحت تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور تاریخی مقامات مقامی معیشت، روزگار اور چھوٹے کاروبار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سندھ کے

تاریخی مقامات اگر جدید سہولیات، بہتر رسائی، مؤثر تشہیر اور ماہر رہنمائی کے ساتھ عالمی سیاحتی نقشے پر مزید نمایاں کیے جائیں تو صوبے میں ثقافتی سیاحت کے وسیع امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس تناظر میں سندھ حکومت کی جانب سے تاریخی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ، بحالی اور فروغ کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی حفاظت، تاریخی عمارتوں کی بحالی، ثقافتی میلوں اور تقریبات کا انعقاد، صوفی ورثے کو اجاگر کرنا اور سندھ کے ثقافتی تشخص کو قومی و عالمی سطح پر متعارف کرانا ایک اہم ذمہ داری ہے۔

ثقافتی ورثے کا تحفظ دراصل آنے والی نسلوں کے لیے اپنی تاریخ محفوظ کرنے کا عمل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخی مقامات کے تحفظ کے ساتھ ان کے بارے میں جدید تحقیقی کام، ڈیجیٹل آرکائیونگ، ورچوئل ٹورز، دستاویزی فلمیں اور تعلیمی پروگرام بھی فروغ دیے جائیں۔ نوجوان نسل کو اپنے تاریخی ورثے سے جوڑنے کے لیے اسکولوں اور جامعات میں سندھ کی تہذیبی تاریخ کو مزید مؤثر انداز میں متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ مقامی آبادی کو بھی ثقافتی ورثے کے تحفظ کے عمل میں شریک کیا جائے تاکہ تاریخی مقامات صرف سرکاری ذمہ داری نہ رہیں بلکہ اجتماعی ملکیت اور فخر کا ذریعہ بنیں۔

یونیسکو کی جانب سے سندھ کے اہم تاریخی مقامات کو عالمی ثقافتی ورثے کی حیثیت ملنا دراصل سندھ کی ہزاروں سالہ تہذیبی عظمت کا عالمی اعتراف ہے۔ تاہم عالمی فہرست میں شامل ہونا منزل نہیں بلکہ ایک بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ ان مقامات کی حفاظت، تحقیق، بحالی اور آئندہ نسلوں تک ان کی اصل تاریخی حیثیت کے ساتھ منتقلی ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔ سندھ کی سرزمین نے انسانی تہذیب کو شہری زندگی کے ابتدائی تصورات سے لے کر صوفیانہ فکر، فنِ تعمیر، شاعری، موسیقی، دستکاری اور رواداری کی روایات تک ایک عظیم ورثہ عطا کیا ہے۔ موئن جو دڑو کے خاموش کھنڈرات، مکلی کے عظیم مقابر، ٹھٹھہ کی تاریخی مسجد، کوٹ ڈیجی اور رنی کوٹ کے قلعے اور سندھ کے صوفی مراکز آج بھی دنیا کو اس خطے کی عظمت کی داستان سناتے ہیں۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم ایسے ورثے کے امین ہیں جو صرف سندھ یا پاکستان کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ سندھ حکومت، محکمۂ ثقافت و سیاحت، آثارِ قدیمہ کے ماہرین، تعلیمی اداروں اور عوام کی مشترکہ کاوشوں سے اس ورثے کو محفوظ، فعال اور عالمی سطح پر مزید نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ سندھ کا ثقافتی ورثہ ہماری شناخت بھی ہے، ہماری تاریخ بھی اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی امانت بھی ہے۔ سندھ کی تاریخ جتنی قدیم ہے، اس کی ثقافت اتنی ہی زندہ ہے؛ اور اس زندہ ورثے کا تحفظ دراصل سندھ کے روشن مستقبل کی حفاظت ہے۔

■

شیخ ایاز وادئ مہران کی روایت، مزاحمت اور امید کا لازوال شاعر

محمد سمیع اللہ

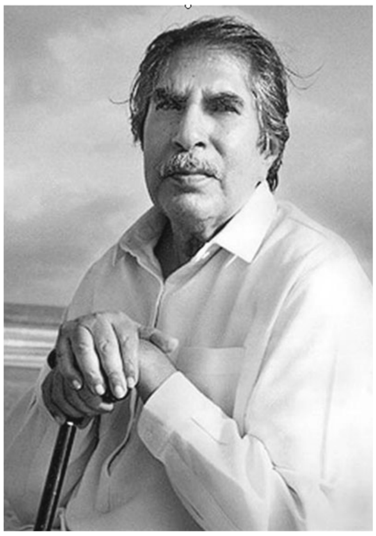

سندھ کی سرزمین نے برصغیر کو ایسے عظیم صوفی، دانشور، ادیب اور شاعر عطا کیے جنہوں نے نہ صرف اپنی دھرتی کے احساسات کو لفظوں میں ڈھالا بلکہ اپنے عہد کے اجتماعی شعور کو بھی نئ زبان عطا کی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور سامی کی فکری روایت سے آگے بڑھتے ہوئے جدید سندھ میں جن شعرا نے سندھی زبان و ادب کو عالمی ادبی منظرنامے سے جوڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا، ان میں شیخ ایاز کا مقام نہایت بلند ہے۔ وہ آزادی کے بعد ابھرنے والے برصغیر ہند و پاک کے ممتاز ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سندھ کی مٹی کی خوشبو، دریائے سندھ کی روانی، صوفیانہ فکر کی گہرائی، انسانی آزادی کی خواہش، محبت کی لطافت اور مزاحمت کی قوت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ شیخ ایاز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے روایت اور جدت کے درمیان ایک نہایت بامعنی اور بارآور رشتہ قائم کیا۔ وہ قدیم اصنافِ سخن سے گہری واقفیت رکھتے تھے، لیکن جب کسی روایتی صنف کو ہاتھ لگاتے تو اسے محض دہراتے نہیں تھے بلکہ اس میں اپنے عہد کی روح پھونک دیتے تھے۔ ان کے ہاں سندھ کی قدیم ادبی روایت جدید احساس، جدید فکر اور جدید شعری اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک طرف ماضی سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف مستقبل کی طرف دیکھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

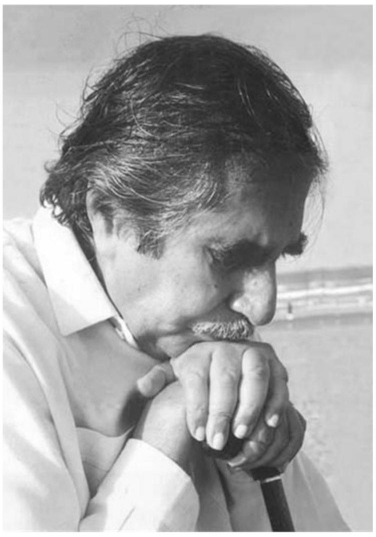

شیخ ایاز نے سندھی شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے کافی، وائی، بیت اور غزل کے علاوہ آزاد اور پابند نظمیں بھی لکھیں۔ طویل منظوم ڈرامے ان کی تخلیقی وسعت کا ثبوت ہیں، جب کہ نثری نظموں میں بھی انہوں نے نئے تجربات کیے۔ اس اعتبار سے ان کا کوئی ایک ہی ادبی سانچہ نہیں تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں روایت کے امین بھی تھے اور نئے شعری امکانات کے تلاش گر بھی۔ ان کی شاعری کا ایک خوبصورت نمونہ وائی کی صورت میں سامنے آتا ہے:

اب تو سورج ڈھل رہا ہے
پربتوں میں

شل ہوئے ہیں پیر تھک کر
پھر بھی کوئی چل رہا ہے
پربتوں میں
ریت کے ٹیلے کے اوپر
وہ دیا جو جل رہا ہے
پربتوں میں
اک نئے سورج کا سپنا
اس کے اندر پل رہا ہے
پربتوں میں
آنے والا دن ابھی سے
اپنی آنکھیں مل رہا ہے
پربتوں میں

یہ اشعار شیخ ایاز کے شعری مزاج کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہاں غروب ہوتا ہوا سورج محض دن کے اختتام کی علامت نہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی علامت ہے جو گزر رہا ہے۔ تھکے ہوئے قدموں کے باوجود چلنے والا انسان جدوجہد، امید اور مسلسل سفر کی علامت بن جاتا ہے۔ ریت کے ٹیلے پر جلتا ہوا چھوٹا سا دیا بظاہر تاریکی میں ایک معمولی روشنی ہے، لیکن شاعر کی نظر میں اسی چراغ کے اندر نئے سورج کا خواب پل رہا ہے۔

برصغیر کے عظیم شاعر فیض احمد فیض کی طرح شیخ ایاز نے بھی قید کو شاعری میں تبدیل کیا۔ ان کی جیل کی شاعری میں ایک طرف تنہائی اور پابندی کا کرب ہے تو دوسری طرف آزادی کی شدید آرزو اور آنے والے بہتر زمانے کا یقین بھی ہے۔ سکھر جیل میں لکھی گئی ان کی ایک وائی اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

شیخ ایاز کے شعری مزاج کی قوت ہے کہ وہ قید کے اندر بھی آزادی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ شیخ ایاز جنگ کے بھی شدید مخالف تھے۔ ان کے نزدیک جنگ صرف سرحدوں پر لڑنے والی فوجوں کا تصادم نہیں بلکہ انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کا المیہ تھی۔ جب بھی جنگی ماحول پیدا ہوا اور انہیں قید کیا گیا، ان کے قلم نے جنگ کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی ایک جیل میں لکھی گئی نظم میں دو قیدیوں کی گفتگو کے ذریعے جنگ کی بے معنویت اور انسان کی مشترکہ انسانی شناخت کو نمایاں کیا گیا ہے:

یہ ہابیل، وہ قابیل
دونوں ایک ہی کوکھ کے باسی
اک دوجے کے خون کے پیاسے

ہابیل اور قابیل کا استعارہ انسانی تاریخ میں بھائی کے ہاتھوں بھائی کے قتل کی سب سے قدیم علامتوں میں سے ایک ہے۔ شیخ ایاز اسے جنگ کے تناظر میں استعمال کرکے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ انسان آخر انسان کا خون کیوں بہاتا ہے؟ ایک ہی دنیا، ایک ہی زمین اور ایک ہی انسانی خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے دشمن کیوں بن جاتے ہیں؟ اسی نظم میں دونوں قیدیوں کی مختلف ترجیحات بھی سامنے آتی ہیں۔ ایک مذہبی کتاب پڑھنے اور روحانی نجات کی بات کرتا ہے جبکہ دوسرا نیند اور خاموشی کی خواہش رکھتا ہے۔ بظاہر یہ دو مختلف دنیائیں ہیں، لیکن دونوں کے گرد جنگ، قید اور خوف کی ایک ہی حقیقت موجود ہے۔ شاعر اس صورت حال کے ذریعے جنگ کے انسانی المیے کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ شیخ ایاز کی شاعری میں سندھ صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی، تاریخی اور روحانی تصور ہے۔ دریائے سندھ، اس کے کنارے، ریت کے ٹیلے، کھجوروں کے درخت، صحرائی وسعتیں، دیہی زندگی، لوک روایتیں اور صوفیانہ مزاج ان کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں۔ ان کے یہاں سندھ کی مٹی بولتی ہے، دریا گاتا ہے اور صحراء اپنے اندر تاریخ کے کئی زمانوں کی داستان لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ایک نظم کے یہ مصرعے امید، مزاحمت اور سندھ سے وابستگی کی خوبصورت ترجمانی کرتے ہیں:

تو جی جو نہ ہارے کوہیارے
یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے
کیوں بیٹھا پیر پسارے
اٹھ کٹ رستے سارے جائیں گے

اور پھر شاعر دریا کے استعارے میں انسان کی اجتماعی جدوجہد کو یوں بیان کرتا ہے:

اس دریا میں جو دہشت ہے
اک دن محشر بن جائے گی
تو اور میں تو بس سندھو میں
اک لہر ابھارے جائیں گے

یہاں سندھو محض دریا نہیں بلکہ سندھ کی تہذیبی روح کی علامت ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ فرد فانی ہے، مگر اس کی جدوجہد اجتماعی زندگی میں ایک لہر پیدا کر سکتی ہے۔ اسی لیے وہ موت کے خوف کے مقابل زندگی، مزاحمت اور نئے کنارے کی امید کو ترجیح دیتا ہے۔ شیخ ایاز کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ محبت اور مزاحمت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتے۔ ان کے ہاں محبت محض ذاتی جذبہ نہیں بلکہ انسان، وطن، دھرتی، آزادی اور امن سے محبت بھی ہے۔ اسی طرح مزاحمت محض سیاسی نعرہ نہیں بلکہ انسانی وقار کے تحفظ کی جدوجہد ہے۔ ان کی شاعری کو اردو میں منتقل کرنا ایک مشکل مگر نہایت اہم ادبی کام ہے۔ سندھی زبان کی اپنی موسیقیت، مخصوص صوتی آہنگ، لوک استعاروں اور تہذیبی حوالوں کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اصل شعری کیفیت برقرار رکھنا آسان نہیں۔ شیخ ایاز کے کلام کے اردو تراجم میں کوشش یہی رہی کہ لفظی ترجمے کے بجائے اصل شاعری کی روح، تال اور کیفیت کو برقرار رکھا جائے۔ شیخ ایاز خود بھی ان تراجم سے خوش تھے۔ یہ ایک مترجم کے لیے بڑی ادبی پذیرائی ہے کہ شاعر اپنی تخلیق کو دوسری زبان میں منتقل ہوتے دیکھے اور اسے قبول کرے۔ ایسے تراجم دراصل دو زبانوں اور دو ادبی روایتوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ سندھی شاعری اردو کے وسیع تر قارئین تک پہنچتی ہے اور سندھ کی تہذیبی آواز ملک کے دوسرے حصوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ شیخ ایاز کی شاعری کو محض ایک مخصوص سیاسی یا تاریخی عہد تک محدود کرنا ان کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کا کلام اپنے عہد کی تاریخ ضرور بیان کرتا ہے، لیکن اس کے موضوعات آج بھی زندہ ہیں۔ آزادی کی خواہش، امن کی ضرورت، جنگ کے خلاف آواز، جبر کے مقابل مزاحمت، انسان سے محبت اور بہتر مستقبل کا خواب ہر دور کے انسان سے متعلق ہے۔ ان کا شعری ورثہ ایک ایسے دور کی یادگار ہے جس میں برصغیر سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے شدید مراحل سے گزر رہا تھا۔ شیخ ایاز نے ان تبدیلیوں کو صرف دیکھا نہیں بلکہ انہیں اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا۔ اسی لیے ان کا کلام ایک شاعر کی ذاتی تخلیق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پورے عہد کی اجتماعی یادداشت بھی ہے۔ شیخ ایاز نے سندھ کی قدیم شعری روایت کو جدید حسیت سے جوڑ کر ثابت کیا کہ عظیم شاعری زمانے کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں شاہ لطیف کی دھرتی، صوفیانہ فکر کی روشنی، جدید انسان کی بے چینی اور آزادی کا خواب ایک ساتھ موجود ہیں۔ وہ روایت سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور روایت کو نئے معنی دینے والے بھی۔ آج جب ہم شیخ ایاز کو یاد کرتے ہیں تو ان کے سامنے صرف ایک عظیم شاعر کی تصویر نہیں آتی بلکہ ایک ایسے ادیب کی شخصیت ابھرتی ہے جس نے قلم کو انسان کی آزادی، امن اور وقار کے لیے استعمال کیا۔ ان کی شاعری کا چراغ آج بھی روشن ہے۔ وقت کے پربتوں میں سورج شاید ڈھلتا رہے، مگر ریت کے ٹیلے پر جلنے والا وہ دیا آج بھی ہمیں نئے سورج کا خواب دکھاتا ہے۔

شیخ ایاز کا ادبی خزانہ سندھ اور پاکستان کا مشترکہ ثقافتی سرمایہ ہے۔ ان کے کلام کی روشنی آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہماری ادبی اور ثقافتی ذمہ داری ہے۔ سندھی میں ان کی شاعری کی تاثیر بے مثال ہے، مگر جب وہ اردو سمیت دوسری زبانوں میں منتقل ہوتی ہے تو اس کی روشنی کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا ہے۔ یہی عظیم شاعری کی اصل طاقت ہے کہ شاعر اپنے زمانے سے آگے نکل کر آنے والے زمانوں سے ہم کلام ہوتا رہتا ہے۔ جب کسی شاعر کا کلام عوام کے دلوں کی آواز بن جائے تو وہ شاعری سماج کو بیدار کرنے والا ہتھیار بن جاتی ہے۔ شیخ ایاز واقعی ایک شاعر نہیں، ایک پورے عہد کی آواز تھے اور ان کی آواز کی ضیا آج بھی کم نہیں ہوئی۔ ■

بچوں کے سرطان سے آگاہی کا دن سندھ حکومت کی بہترین کاوشیں اور ترجیحی اقدامات

اطہر بیگ

ہر سال ستمبر کا مہینہ دنیا بھر میں بچوں کے سرطان سے آگاہی کے مہینے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ مہینہ اس عزم کی تجدید کا موقع فراہم کرتا ہے کہ بچوں میں سرطان کی بروقت تشخیص، مؤثر علاج، معیاری طبی سہولیات اور متاثرہ خاندانوں کی معاونت کو صحتِ عامہ کی ترجیحات میں نمایاں مقام دیا جائے۔

بچپن میں سرطان ایک سنگین طبی چیلنج ضرور ہے، تاہم بروقت تشخیص، جدید طبی سہولیات، ماہرین کی نگرانی اور مسلسل علاج کے ذریعے بہت سے بچوں کو صحت یاب زندگی کی طرف واپس لایا جاسکتا ہے۔

بچوں میں سرطان کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں، جن میں لیوکیمیا، لمفوما، دماغی رسولیاں اور دیگر اقسام شامل ہیں۔ بچوں میں بیماری کی ابتدائی علامات بعض اوقات عام بیماریوں سے مشابہ ہوتی ہیں، اس لیے والدین، اساتذہ اور بنیادی صحت کے مراکز میں کام کرنے والے طبی عملے کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر معمولی علامات کو نظر انداز نہ کریں۔ مسلسل بخار، جسم پر غیر معمولی نیل یا خون بہنا، رنگت کا زرد یا پھیکا پڑ جانا، وزن میں غیر واضح کمی، مسلسل ہڈیوں یا جوڑوں کا درد، غیر معمولی گلٹیاں، سر درد یا جسمانی کمزوری جیسی علامات کی صورت میں بروقت طبی معائنہ انتہائی اہم ہے۔

سندھ میں بچوں کی صحت کے تحفظ اور انہیں معیاری طبی سہولیات کی فراہمی کے لیے صوبائی حکومت کی کاوشیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ بچوں کے پیچیدہ امراض، بالخصوص سرطان کے علاج کے لیے مخصوص طبی اداروں، تربیت یافتہ طبی ماہرین، تشخیصی سہولیات اور علاج کے مربوط نظام کی موجودگی اس امر کی عکاس ہے کہ بچوں کی صحت سندھ کے صحت عامہ کے ایجنڈے میں ایک اہم ترجیح ہے۔

اس حوالے سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ (NICH)، کراچی بچوں کے پیچیدہ اور سنگین امراض کے علاج میں ایک اہم قومی ادارے کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہے۔ بچوں کے سرطان کے علاج کے شعبے میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ کی خدمات خصوصاً قابلِ ذکر ہیں، جہاں بچوں کو تشخیص، کیموتھراپی، معاون طبی نگہداشت اور دیگر ضروری سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ سندھ اور ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والے بچوں کے لیے ایسے

ادارے امید، علاج اور زندگی کی نئی راہیں فراہم کرتے ہیں۔

بچوں کے سرطان کے علاج میں صرف بیماری کی تشخیص کافی نہیں بلکہ ایک جامع اور مسلسل نگہداشت کا نظام ضروری ہوتا ہے۔ اس میں تشخیصی ٹیسٹ، ماہرینِ امراضِ اطفال اور آنکولوجی کی نگرانی، ادویات کی دستیابی، غذائی معاونت، انفیکشن سے بچاؤ، خون اور دیگر طبی ضروریات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بچے اور اس کے خاندان کی نفسیاتی و سماجی معاونت بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں سرکاری اداروں، طبی ماہرین، فلاحی تنظیموں اور معاشرے کے مختلف طبقات کا باہمی تعاون اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سندھ میں صحت کے شعبے میں جاری اقدامات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ علاج کے ساتھ ساتھ بیماری سے بچاؤ، آگاہی اور بروقت تشخیص پر توجہ دی جائے۔ بچوں کے سرطان کے حوالے سے عوامی آگاہی میں اضافہ والدین کو ابتدائی علامات کی شناخت میں مدد دے سکتا ہے اور بچوں کو علاج کے مراکز تک بروقت پہنچانے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں بیماری کی تشخیص علاج کے بہتر نتائج کے امکانات کو بڑھا سکتی ہے۔ یہ امر بھی قابلِ تحسین ہے کہ سندھ میں بچوں کے لیے مخصوص طبی اداروں اور مراکز کے ذریعے پیچیدہ بیماریوں کے علاج کی سہولیات کو مضبوط بنانے پر توجہ دی جا رہی ہے۔ بالخصوص نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ جیسے ادارے نہ صرف مریض بچوں کے علاج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ طبی تعلیم، تربیت اور تشخیص کے ذریعے ملک کے مستقبل کے طبی ماہرین کی تیاری میں بھی حصہ لیتے ہیں۔

بچوں کا سرطان صرف ایک طبی مسئلہ نہیں بلکہ پورے خاندان کے لیے ایک مشکل اور جذباتی مرحلہ ہوتا ہے۔ علاج کے طویل دورانیے کے دوران والدین کو مالی، نفسیاتی اور سماجی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ریاستی اداروں اور معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ متاثرہ بچوں اور ان کے خاندانوں کو علاج کے ساتھ مناسب رہنمائی اور معاونت بھی فراہم کی جائے۔ ایک ایسا صحت کا نظام جو مریض بچے کو صرف ایک کیس نہیں بلکہ ایک مکمل انسانی وجود سمجھتے ہوئے علاج، دیکھ بھال اور بحالی کی سہولیات فراہم کرے، حقیقی معنوں میں انسان دوست نظام کہلاتا ہے۔ ستمبر کا یہ مہینہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر بچے کو صحت مند زندگی، تعلیم، کھیل اور مستقبل کے خواب دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ بچوں کے سرطان کے خلاف جدوجہد میں آگاہی، بروقت تشخیص، معیاری علاج اور مسلسل معاونت چار بنیادی ستون ہیں۔ سندھ حکومت کی جانب سے بچوں کی صحت کے شعبے میں اقدامات، خصوصی طبی اداروں کی سرپرستی اور علاج کی سہولیات کی فراہمی اس عزم کو تقویت دیتی ہے کہ سندھ میں کوئی بچہ صرف بروقت طبی سہولت نہ ملنے کی وجہ سے علاج سے محروم نہ رہے۔

جیسے جیسے کینسر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتا ہے، بچوں کے کینسر کے کسی نہ کسی مریض کو جاننے کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے، جیسے ان کے دادا دادی، والدین یا کوئی دوست۔ یہ ان کے لیے باعثِ تشویش ہوتا ہے اور وہ ممکنہ طور پر اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ کسی سے اس بارے میں پوچھ ہی نہ سکیں۔ کینسر کے بارے میں بچوں کی معلومات ناقص ہیں، اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کو کینسر کی تعلیم دیں۔ بچوں کے سرطان سے آگاہی کے اس مہینے میں ہمیں یہ پیغام عام کرنا ہوگا کہ سرطان خوف کا نہیں، بروقت تشخیص اور مؤثر علاج کا تقاضا کرتا ہے۔ والدین علامات کو نظر انداز نہ کریں، طبی ماہرین سے بروقت رجوع کریں اور حکومت، طبی ادارے اور معاشرہ مل کر ایسے بچوں کے لیے امید اور صحت کا راستہ ہموار کریں۔ سندھ کے صحت کے اداروں، بالخصوص بچوں کی تخصصی طبی خدمات فراہم کرنے والے اداروں کی کاوشیں اس اجتماعی مقصد کے حصول میں قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہیں۔

حال ہی میں بی ایم جے آنکالوجی کی جانب سے شائع کی جانے والی ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ سنہ 1990 سے 2019 کے درمیان دنیا بھر میں 50 سال سے کم عمر کے افراد میں کینسر کی شرح میں 79 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جبکہ ان افراد میں کینسر سے اموات کی شرح 28 فیصد بڑھی ہے۔ اس تحقیق میں 200 سے زائد

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ جیسے ادارے سندھ اور ملک بھر سے آنے والے بچوں کے لیے امید کی ایک اہم علامت ہیں۔ بچوں کے سرطان سمیت مختلف پیچیدہ امراض کے علاج، تشخیص اور طبی نگہداشت میں ایسے اداروں کا کردار نہایت اہم ہے۔ سندھ حکومت اور محکمۂ صحت کی ان کاوشوں کو سراہتے ہوئے اس عزم کا اعادہ ضروری ہے کہ بچوں کی صحت، بروقت تشخیص اور معیاری علاج کے لیے اقدامات کا یہ سلسلہ مزید مضبوط کیا جائے۔

ممالک میں کینسر کے 29 اقسام کے کیسوں کا معائنہ کیا گیا ہے۔ کیسز میں اضافے کی ممکنہ وجوہات میں گوشت اور سوڈیم کی زیادہ مقدار میں استعمال اور پھلوں اور دودھ کے استعمال میں کمی کے ساتھ ساتھ شراب اور تمباکو نوشی شامل ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ الٹرا پروسیسڈ فوڈ ایڈیٹیو جیسے کہ ایملسیفائر اور مصنوعی رنگ آنتوں کی سوزش اور ڈی این اے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ امریکن ایسوسی ایشن برائے کینسر ریسرچ کے مطابق ہاضمے میں رکاوٹ نہ صرف کولوریکٹل کینسر بلکہ چھاتی اور خون کے کینسر سے بھی منسلک ہے۔

بچوں کے سرطان کے بارے میں آگاہی کو ہر گھر تک پہنچائیں گے، بروقت تشخیص کی حوصلہ افزائی کریں گے اور ہر متاثرہ بچے کے لیے علاج، امید اور بہتر مستقبل کی کوشش جاری رکھیں گے۔ بچوں کی صحت اور بالخصوص سرطان جیسے پیچیدہ امراض کے علاج کے لیے سندھ حکومت کی جانب سے طبی سہولیات کی فراہمی اور خصوصی اداروں کی معاونت قابلِ تحسین ہے۔ بچوں کو بروقت تشخیص، جدید علاج اور ماہر طبی نگہداشت کی سہولیات فراہم کرنا ایک صحت مند اور محفوظ معاشرے کی بنیاد ہے۔ اس حوالے سے محکمۂ صحت سندھ کی کاوشیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں، جو بچوں کے علاج اور صحتِ عامہ کے نظام کو مزید مؤثر بنانے کے لیے مختلف اقدامات کر رہا ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ جیسے ادارے سندھ اور ملک بھر سے آنے والے بچوں کے لیے امید کی ایک اہم علامت ہیں۔ بچوں کے سرطان سمیت مختلف پیچیدہ امراض کے علاج، تشخیص اور طبی نگہداشت میں ایسے اداروں کا کردار نہایت اہم ہے۔ ان اداروں کی سرپرستی اور طبی سہولیات کو مضبوط بنانے کے اقدامات اس عزم کا اظہار ہیں کہ کوئی بچہ محض علاج کی سہولت تک رسائی نہ ہونے کے باعث زندگی کی جنگ نہ ہارے۔ سندھ حکومت اور محکمۂ صحت کی ان کاوشوں کو سراہتے ہوئے اس عزم کا اعادہ ضروری ہے کہ بچوں کی صحت، بروقت تشخیص اور معیاری علاج کے لیے اقدامات کا یہ سلسلہ مزید مضبوط کیا جائے۔

■

سندھ طاس معاہدہ، پاکستان کے آبی حقوق کا مضبوط قانونی حصار

محمد آصف احمد

پانی کسی بھی ملک کی معیشت، زراعت، توانائی، ماحولیات اور انسانی زندگی کے لیے بنیادی ضرورت ہے، لیکن جنوبی ایشیا میں پانی صرف ایک قدرتی وسیلہ نہیں بلکہ ایک اہم جغرافیائی، معاشی اور سفارتی مسئلہ بھی بن چکا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا معاملہ گزشتہ کئی دہائیوں سے دونوں ممالک کے تعلقات کا حساس ترین موضوع رہا ہے۔ تاہم 31 اگست 2026ء کو دی ہیگ میں قائم سندھ طاس معاہدے کے تحت عدالتِ ثالثی کے تازہ فیصلے نے اس تنازعے کو ایک مرتبہ پھر بین الاقوامی قانون اور معاہداتی ذمہ داریوں کے مرکز میں لا کھڑا کیا ہے۔

1960ء کا سندھ طاس معاہدہ جنوبی ایشیا میں پانی کی تقسیم کے حوالے سے دنیا کے اہم ترین بین الاقوامی معاہدوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ 19 ستمبر 1960ء کو پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور عالمی بینک کے نمائندے کی موجودگی میں طے پایا۔ اس معاہدے تک پہنچنے کے لیے تقریباً نو برس مذاکرات ہوئے اور عالمی بینک نے مذاکرات میں ثالثی اور سہولت کاری کا کردار ادا کیا۔ عالمی بینک کے مطابق یہ معاہدہ کئی جنگوں، سیاسی کشیدگی اور مسلسل باہمی اختلافات کے باوجود چھ دہائیوں سے زیادہ عرصے تک قائم رہا ہے۔

سندھ طاس معاہدے کے تحت دریائے سندھ کے نظام کے چھ بڑے دریاؤں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ مشرقی دریاؤں، یعنی راوی، بیاس اور ستلج کے پانی پر بنیادی طور پر بھارت کو حق دیا گیا، جبکہ مغربی دریاؤں، یعنی دریائے سندھ، جہلم اور چناب کے پانی کے استعمال کا بنیادی حق پاکستان کو حاصل ہوا۔ عالمی بینک کی دستاویزات کے مطابق مشرقی دریاؤں کا اوسط سالانہ بہاؤ تقریباً 40.7 ارب مکعب میٹر، یعنی تقریباً 33 ملین ایکڑ فٹ، ریکارڈ کیا گیا تھا۔

یہ تقسیم اگرچہ بظاہر تین دریا بمقابلہ تین دریا معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی اصل اہمیت پانی کے حجم اور پاکستان کی زرعی ضروریات میں پوشیدہ ہے۔ پاکستان کے لیے مغربی دریاؤں کا پانی قومی آب پاشی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ طاس معاہدے کی سلامتی پاکستان کی غذائی، زرعی، معاشی اور ماحولیاتی سلامتی سے براہِ راست جڑی ہوئی ہے۔ عالمی سطح پر دستیاب حالیہ تجزیوں کے مطابق پاکستان کی تقریباً 80 فیصد زرعی زمین کی آب پاشی سندھ طاس کے دریائی نظام سے وابستہ ہے۔

معاہدے نے بھارت کو مغربی دریاؤں پر مکمل طور پر بے دخل نہیں کیا بلکہ مخصوص شرائط کے تحت محدود زرعی، گھریلو اور غیر صرفی استعمال کے علاوہ دریا کے قدرتی بہاؤ پر بننے والا پن بجلی گھر کی نوعیت کے پن بجلی منصوبے تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ تاہم ان منصوبوں کے ڈیزائن، پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت، دریا کے بہاؤ اور دیگر تکنیکی پہلوؤں کے لیے معاہدے میں واضح حدود مقرر کی گئی ہیں۔ یہی تکنیکی شرائط بعد ازاں کشن گنگا اور رَٹل پن بجلی منصوبوں کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعے کا سبب بنیں۔

سندھ طاس معاہدے کی ایک اہم خصوصیت اس کا باقاعدہ تنازعہ حل کرنے کا نظام ہے۔ معاہدے کے تحت مستقل کمیشن برائے طاسِ سندھ قائم کیا گیا، جس میں دونوں ممالک کا ایک ایک کمشنر شامل ہوتا ہے۔ عالمی بینک کے مطابق 2016ء میں پاکستان نے عدالتِ ثالثی کے قیام کی درخواست کی جبکہ بھارت نے غیر جانبدار ماہر مقرر کرنے کی درخواست کی۔ صورتحال نے اس وقت نیا رخ اختیار کیا جب اپریل 2025ء میں پہلگام حملے کے بعد بھارت نے سندھ طاس معاہدے کو التوا میں رکھنے کا اعلان کیا۔ بھارت نے اپنے اقدام کو سلامتی کے خدشات اور پاکستان پر عائد الزامات سے جوڑا، جبکہ پاکستان نے اس مؤقف کو مسترد کرتے ہوئے واضح کیا کہ ایک بین الاقوامی معاہدے کو یک طرفہ طور پر معطل یا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی پس منظر میں معاملہ بین الاقوامی قانونی فورم کے سامنے مزید اہم ہوگیا۔ اس قانونی عمل کا سب سے اہم مرحلہ 31 اگست 2026 کو سامنے آیا۔ عدالتِ ثالثی نے متفقہ طور پر دو اہم فیصلے جاری کیے: پہلا سندھ طاس معاہدے کی قانونی حیثیت سے متعلق ایوارڈ اور دوسرا رَٹل پن بجلی منصوبے سے متعلق عبوری اقدامات کا آرڈر دیا۔ عدالت نے قرار دیا کہ بھارت کا التوا کا مؤقف قانونی طور پر معاہدے کو معطل یا ختم نہیں کرتا۔

یہ فیصلہ پاکستان کے لیے اس اعتبار سے اہم ہے کہ عدالت نے بنیادی طور پر اس قانونی اصول کی توثیق کی کہ بین الاقوامی معاہدے محض یک طرفہ سیاسی فیصلے کے ذریعے ختم یا معطل نہیں کیے جاسکتے۔

عدالت نے بھارت کی طرف سے پیش کیے گئے ان جوازوں کو بھی معاہدے کی معطلی یا خاتمے کے لیے کافی نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر نئی دہلی نے معاہدے کو 'التوا میں رکھنے کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ قانونی سطح پر پاکستان کے اس مؤقف کو تقویت ملی کہ سندھ طاس معاہدہ ایک زندہ اور قابلِ نفاذ بین الاقوامی ذمہ داری ہے۔ فیصلے کا دوسرا اہم پہلو رَٹل پن بجلی منصوبے سے متعلق عبوری حکم ہے۔ یہ پابندی غیر جانبدار ماہر کے حتمی فیصلے کے 90 دن بعد تک برقرار رہے گی۔ غیر جانبدار ماہر کی حتمی رائے جولائی 2027 میں متوقع ہے۔ عدالت نے رَٹل منصوبے کے تعمیراتی شیڈول سے متعلق رپورٹنگ کی شرط بھی عائد کی، تاہم پاکستان کی جانب سے طلب کی گئی دو دیگر عبوری تدابیر منظور نہیں کی گئیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ 31 اگست 2026 کا فیصلہ رَٹل منصوبے کے تمام تکنیکی معاملات پر حتمی فیصلہ نہیں ہے۔ اس کا ایک اہم حصہ معاہدے کی قانونی حیثیت سے متعلق ہے، جبکہ رَٹل کے ڈیزائن کی معاہدے سے مطابقت کا حتمی تکنیکی تعین غیر جانبدار ماہر کے عمل سے متعلق ہے۔

بھارت نے تاہم اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ بھارتی وزارت خارجہ نے عدالتِ ثالثی کے دائرۂ اختیار کو مسترد کرتے ہوئے اسے غیر قانونی طور پر تشکیل دیا گیا فورم قرار دیا اور کہا کہ بھارت کی جانب سے سندھ طاس معاہدے کو التوا میں رکھنے کا فیصلہ برقرار ہے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ عدالت کو اس کے خودمختار فیصلوں پر حکم دینے کا اختیار نہیں۔ یوں ایک طرف بین الاقوامی عدالت نے معاہدے کے نفاذ کو برقرار رکھنے کا مؤقف اختیار کیا ہے، جبکہ دوسری جانب بھارت نے فیصلے کی قانونی حیثیت ہی کو چیلنج کیا ہے۔

پاکستان نے اس کے برعکس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے بین الاقوامی قانون، معاہداتی ذمہ داریوں اور سندھ طاس معاہدے کی قانونی حیثیت کی توثیق قرار دیا ہے۔ پاکستانی وزارت خارجہ نے 2 ستمبر 2026 کو واضح کیا کہ عدالت کا متفقہ فیصلہ اس امر کی دوبارہ تصدیق کرتا ہے کہ معاہدہ مکمل طور پر نافذ العمل ہے اور بھارت یک طرفہ اقدام کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں سے بری

پاکستان کی خاتونِ اول محترمہ آصفہ بھٹو زرداری نے کورنگی میں واقع 'سینٹر فار آٹزم ری ہیبیلی ٹیشن اینڈ ٹریننگ، سندھ' (C-ARTS) میں آٹزم کے شکار بچوں کے لیے پاکستان کی پہلی مخصوص رہائشی سہولت کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ بھی موجود ہیں۔

پاکستان کی خاتونِ اول محترمہ آصفہ بھٹو زرداری نے کورنگی میں واقع 'سینٹر فار آٹزم ری ہیبیلی ٹیشن اینڈ ٹریننگ، سندھ' (C-ARTS) کا دورہ کیا، اس موقع پر وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ بھی موجود ہیں۔

گورنر سندھ محمد نہال ہاشمی، وزیرِ اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ اور صوبائی کابینہ کے اراکین کے ہمراہ، پاکستان کے 79ویں یومِ آزادی کے موقع پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کے مزار پر فاتحہ خوانی کر رہے ہیں۔

گورنر سندھ محمد نہال ہاشمی، وزیرِ اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کے ہمراہ، پاکستان کے 79ویں یومِ آزادی کے موقع پر مزارِ قائد پر میڈیا سے گفتگو کر رہے ہیں۔

سینئر وزیر اطلاعات، ٹرانسپورٹ اور ماس ٹرانزٹ شرجیل انعام میمن بی آر ٹی ریڈ لائن منصوبے کا دورہ کر رہے ہیں۔

سینئر وزیر اطلاعات، ٹرانسپورٹ اور ماس ٹرانزٹ شرجیل انعام میمن سندھ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے۔

وزیر بلدیات، ہاؤسنگ ٹاؤن پلاننگ سندھ سید ناصر حسین شاہ کورنگی نمبر 5 پر تعمیر کیے گئے کورنگی لانڈھی فلائی اوور کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔ اس موقع پر میئر کراچی مرتضیٰ وہاب بھی موجود ہیں۔

وزیر محنت و افرادی قوت سندھ سعید غنی نے ٹاؤن میونسپل کارپوریشن کورنگی کے تحت ٹی ایم سی انگلش میڈیم ماڈل اسکول (شہید نجیب احمد کیمپس) کا افتتاح کیا۔

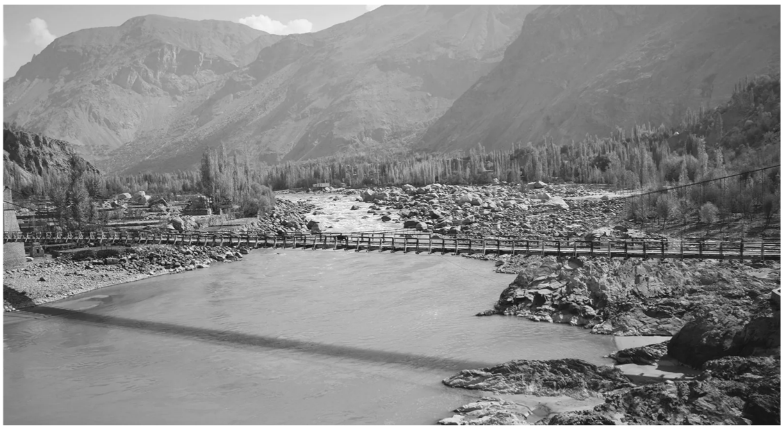

الذمہ نہیں ہو سکتا۔ پاکستان نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کے لیے تمام سفارتی اور قانونی راستے اس کے سامنے موجود ہیں۔ سندھ چونکہ دریائے سندھ کا زیریں علاقہ ہے، اس لیے بالائی سطح پر پانی کے بہاؤ میں تبدیلیاں بالآخر صوبے کے آب پاشی نظام، فصلوں، پینے کے پانی، ماہی گیری، آبی حیات اور دریائے سندھ کے ڈیلٹا پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ سندھ کے ساحلی اور زیریں علاقوں کے لیے دریا کا مسلسل بہاؤ صرف زرعی ضرورت نہیں بلکہ ماحولیاتی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔

عالمی بینک نے نشاندہی کی ہے کہ دریائے سندھ کا سمندر میں اوسط سالانہ بہاؤ گزشتہ کئی دہائیوں میں نمایاں طور پر کم ہوا ہے اور 80 فیصد سے زیادہ کمی کے شواہد موجود ہیں۔ اس صورتحال نے زیریں دریائی نظام، ڈیلٹا، ماہی گیری اور ساحلی ماحولیاتی خدمات کو متاثر کیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور پانی کی طلب کے تناظر میں سندھ کے لیے دریائے سندھ کے ماحولیاتی بہاؤ کا تحفظ مستقبل کی ایک بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔ اس لیے سندھ طاس معاہدے کا تحفظ صرف پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک سفارتی تنازعے کا معاملہ نہیں بلکہ سندھ کے لیے زرعی اور ماحولیاتی سلامتی کا سوال بھی ہے۔ اگر دریائی پانی کو سیاسی دباؤ، کشیدگی یا جغرافیائی طاقت کے آلے کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان مضبوط ہوتا ہے تو اس کے اثرات سرحدوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ اس کے اثرات دریائے سندھ کے پورے نظام، بالخصوص زیریں سندھ اور ڈیلٹا تک پہنچ سکتے ہیں۔

31 اگست 2026 کا فیصلہ اسی لیے ایک اہم قانونی سنگِ میل ہے۔ اس نے یہ اصول واضح کیا ہے کہ بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی اور ان کے تحت قائم تنازعہ حل کرنے کے طریقہ کار کو یک طرفہ سیاسی فیصلوں سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس فیصلے کے بعد اصل چیلنج اس کی عملی پاسداری اور دونوں ممالک کے درمیان مذاکراتی و ادارہ جاتی نظام کی بحالی ہے۔ پاکستان کے لیے آئندہ حکمتِ عملی کا اہم حصہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ عالمی سطح پر اپنے قانونی مؤقف کو مسلسل مؤثر انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندرونی آبی نظام کو بھی مضبوط بنائے۔ پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت، جدید آب پاشی، پانی کے ضیاع میں کمی، فصلوں کی بہتر منصوبہ بندی، سیلابی پانی کا انتظام، زیرِ زمین پانی کے پائیدار استعمال اور سندھ ڈیلٹا کے ماحولیاتی بہاؤ کا تحفظ قومی آبی پالیسی کا بنیادی حصہ ہونا چاہیے۔

سندھ طاس معاہدہ 1960 میں صرف دو ممالک کے درمیان پانی کی تقسیم کا سمجھوتا نہیں تھا؛ یہ اس بات کی مثال بھی تھا کہ شدید سیاسی اختلافات رکھنے والی ریاستیں بھی مشترکہ قدرتی وسائل کے بارے میں قابلِ عمل قانونی فریم ورک تشکیل دے سکتی ہیں۔ اس معاہدے نے 1960 سے اب تک جنگوں اور بحرانوں کے باوجود اپنا وجود برقرار رکھا۔ موجودہ دور میں اس معاہدے کا تحفظ جنوبی ایشیا میں پانی کے پرامن انتظام، علاقائی استحکام اور بین الاقوامی قانون کی بالادستی کے لیے بھی اہم ہے۔

31 اگست 2026 کا دی ہیگ کا فیصلہ پاکستان کے لیے ایک اہم قانونی اور سفارتی کامیابی ضرور ہے، لیکن اصل کامیابی اس وقت ہوگی جب سندھ طاس معاہدے کے تحت قائم نظام دوبارہ مؤثر انداز میں کام کرے، پانی کو سیاسی تنازعے کے بجائے مشترکہ ذمہ داری سمجھا جائے اور دریائے سندھ کے پانی کو سندھ کے کھیتوں، شہروں، ماہی گیروں، ساحلی آبادیوں اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ پانی زندگی ہے، اور دریائے سندھ پاکستان کی زندگی کی ایک بنیادی علامت ہے۔ اس کا تحفظ محض آج کی ضرورت نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کی ضمانت ہے۔■

سندھ کی خود مختاری اور میر نصیر خان کا عہد

پروین بلوچ

میر نصیر خان تالپور، سندھ کی خود مختاری، تہذیب اور مزاحمت کا ایک تاریخی باب

سندھ کی تاریخ میں تالپور دور کو ایک اہم سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی عہد کی حیثیت حاصل ہے۔ 1783ء میں میاں عبدالنبی کلہوڑو کے دور کے اختتام اور ہالانی کی جنگ کے بعد تالپور خاندان سندھ کے اقتدار میں آیا۔ میر فتح علی خان تالپور اور ان کے بھائیوں نے ''چویاری'' کے نظام کے تحت سندھ کی حکمرانی سنبھالی اور حیدرآباد کو مرکزی سیاسی مرکز بنایا۔ تالپور حکمرانوں نے تقریباً ساٹھ برس تک سندھ پر حکومت کی اور 1843ء میں برطانوی قبضے تک سندھ کی سیاسی شناخت اور علاقائی خود مختاری برقرار رہی۔ میر محمد نصیر خان تالپور اسی حکمران خاندان کی اہم شخصیت تھے۔ ان کی تاریخِ پیدائش کے حوالے سے بعض ماخذوں میں اختلاف ملتا ہے، تاہم ایک معروف تحقیقی روایت کے مطابق وہ 17 مئی 1802ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ میر مراد علی خان تالپور کے صاحبزادے تھے۔ کم عمری ہی سے انہیں علم و ادب، فارسی زبان اور شاعری سے خصوصی شغف تھا۔ بعد ازاں وہ ''جعفری'' تخلص سے شاعری کرنے لگے اور فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی۔

میر نصیر خان کا دور ایک ایسے وقت میں شروع ہوا جب برصغیر میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی سیاسی اور عسکری طاقت کو مسلسل وسعت دے رہی تھی۔ افغانستان کی جنگوں کے تناظر میں سندھ کی جغرافیائی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ دریائے سندھ، سندھ کی بندرگاہیں، تجارتی راستے اور افغانستان تک رسائی برطانوی حکمتِ عملی کے لیے نہایت اہم تھے۔ ابتدا میں برطانوی نمائندوں کے ساتھ معاہدے کیے گئے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان معاہدوں نے سندھ کی داخلی اور خارجی خود مختاری کو محدود کرنا شروع کر دیا۔

1838ء کے معاہدے کے نتیجے میں حیدرآباد میں برطانوی سیاسی نمائندگی اور افغانستان میں برطانوی کارروائیوں کے لیے سندھ میں فوجی نقل و حرکت کی اجازت جیسے اقدامات سامنے

آئے۔ تالپور حکمرانوں کے لیے یہ صورتِ حال آسان نہ تھی، کیونکہ بظاہر معاہدات موجود تھے لیکن عملی طور پر برطانوی اثر و رسوخ سندھ کے سیاسی معاملات میں بڑھتا جا رہا تھا۔

میر نصیر خان کے عہد کو صرف ایک حکمران کی ذاتی سیاسی جدوجہد کے طور پر دیکھنا سندھ کی اس دور کی تاریخ کو محدود کر دینا ہوگا۔ اصل مسئلہ سندھ کی خود مختاری کا تھا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی سندھ کو اپنے وسیع تر ہندوستانی سیاسی و عسکری نظام کا حصہ بنانا چاہتی تھی، جبکہ سندھ کے حکمران اپنے اقتدار اور علاقائی خود اختیاری کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس دور میں تالپور خاندان کے مختلف دھڑوں کے درمیان سیاسی اختلافات بھی موجود تھے۔ حیدرآباد، خیرپور اور میرپورخاص کی تالپور شاخیں اپنی اپنی سیاسی ترجیحات رکھتی تھیں۔ یہی اندرونی اختلافات بعد میں برطانوی پالیسی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ بعض تاریخی مطالعات میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی حکمتِ عملی کے ذریعے تالپور حکمرانوں کے باہمی اختلافات کو بڑھایا گیا۔

1842ء میں سر چارلس نیپیئر کی سندھ آمد نے صورتحال کو مزید سنگین بنا دیا۔ نیپیئر سندھ کے ساتھ سابقہ برطانوی نمائندوں کی نسبت زیادہ جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کے لیے معروف ہوا۔ برطانوی حکام نے تالپور حکمرانوں پر مختلف الزامات عائد کیے اور نئے معاہدوں اور سیاسی شرائط کے ذریعے ان پر دباؤ بڑھایا۔ یوں مذاکرات، معاہدات اور سیاسی کشمکش بالآخر جنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ میر نصیر خان کی تاریخی اہمیت اس حقیقت میں بھی ہے کہ وہ ایسے دور میں سندھ کے حکمران تھے جب ایک طاقتور نوآبادیاتی قوت کے سامنے مقامی خود مختاری کا سوال کھڑا ہو چکا تھا۔ ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایک طرف داخلی سیاسی اختلافات کو سنبھالیں اور دوسری طرف برطانوی دباؤ کا مقابلہ کریں۔

17 فروری 1843ء کو حیدرآباد کے قریب میانی کے میدان میں سندھ کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن معرکہ پیش آیا۔ ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج تھی جس کی قیادت سر چارلس نیپیئر کر رہے تھے اور دوسری جانب تالپور حکمرانوں کی فوج اور بلوچ قبائلی دستے موجود تھے۔ جنگ میں سندھ کے مختلف قبائل اور جنگجوؤں نے بھی شرکت کی۔

میر نصیر خان اس معرکے میں موجود تھے اور سندھ کی فوجی مزاحمت کی قیادت کرنے والے اہم حکمرانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ برطانوی فوج تعداد میں کم ہونے کے باوجود تربیت، نظم و ضبط، توپ خانے، اسلحے اور عسکری تنظیم کے اعتبار سے زیادہ مضبوط تھی۔ دوسری جانب سندھ کی فوج میں غیر معمولی شجاعت اور جوش موجود تھا، مگر جدید عسکری تنظیم اور اسلحے کی کمی ایک بڑی کمزوری ثابت ہوئی۔ جنگِ میانی میں تالپور افواج کو شکست ہوئی۔ اس شکست نے سندھ کے سیاسی مستقبل کو یکسر بدل دیا۔ میر نصیر خان کو اگلے ہی روز دیگر تالپور حکمرانوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور بعد ازاں انہیں کلکتہ جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طرح وہ اپنے وطن، اقتدار اور سیاسی مرکز سے دور ایک قیدی حکمران کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں ایک اہم تاریخی وضاحت ضروری ہے: میر نصیر خان جنگِ میانی میں مارے نہیں گئے تھے۔ وہ گرفتار ہوئے اور جلاوطنی کے دوران 1845ء میں وفات پا گئے۔ حکومتِ سندھ کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ کے مطابق ان کا مقبرہ حیدرآباد میں موجود ہے اور یہ تالپور دور کے تاریخی آثار میں شامل ہے۔ میانی کی شکست کے باوجود سندھ کی مزاحمت ختم نہیں ہوئی۔ میرپورخاص کے میر شیر محمد خان تالپور نے بعد میں برطانوی قبضے کے خلاف جنگ جاری رکھی اور 24 مارچ 1843ء کو دوبّو کی جنگ میں مزاحمت کی۔ یوں میانی اور دوبّو سندھ کی آزادی کے آخری بڑے معرکوں کی علامت بن گئے۔

میر نصیر خان: حکمران کے ساتھ ایک صاحبِ علم و ادب شخصیت: میر نصیر خان تالپور کی شخصیت کا ایک روشن پہلو ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں ہیں۔ انہیں فارسی اور اردو شاعری سے گہرا شغف تھا اور ''جعفری'' ان کا شعری تخلص تھا۔ ان کی فارسی تصانیف میں دیوانِ قصائدِ جعفری، دیوانِ جعفری، مثنوی مرزا

صاحباں اور مثنوی مختار نامہ کا ذکر ملتا ہے۔ بعد ازاں جلاوطنی کے دوران انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ ان کی شاعری محض درباری تفریح نہیں تھی بلکہ اس میں مذہبی عقیدت، اہلِ بیت سے محبت، اخلاقی موضوعات اور ذاتی احساسات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جلاوطنی کے دوران لکھی گئی ''سفر نامہ جعفری'' کو ان کی اس تکلیف دہ زندگی کا ادبی اظہار سمجھا جاتا ہے جس میں قید، جلاوطنی اور وطن سے دوری کے احساسات شامل تھے۔

میر نصیر خان کی ادبی شخصیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ تالپور دربار سندھ میں فارسی، اردو اور سندھی تہذیبی روایتوں کے باہمی میل جول کا ایک مرکز تھا۔ ان کے عہد میں حیدرآباد نہ صرف سیاسی دارالحکومت تھا بلکہ علم، ادب، فنون اور مذہبی ثقافت کا بھی اہم مرکز تھا۔ مذہبی و تہذیبی تعمیرات کے حوالے سے بھی میر نصیر خان کا نام ملتا ہے۔ محکمہ ثقافت کے ایک تاریخی ماخذ کے مطابق انہوں نے عوام کی درخواست پر حیدرآباد میں حضرت علیؓ سے منسوب مقدس نقوشِ قدم کے لیے ایک ایسی عمارت تعمیر کرائی جسے عام لوگوں کے لیے بھی زیارت کے مقصد سے کھولا گیا۔ یہ اقدام ان کے مذہبی اور سماجی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

میر نصیر خان تالپور کی زندگی کا سب سے بڑا سبق سندھ کی خودمختاری اور اپنی سرزمین سے وابستگی ہے۔ اگرچہ سیاسی اور عسکری حالات ان کے حق میں نہ تھے، لیکن ان کا دور سندھ کی تاریخ میں ایک ایسے مرحلے کے طور پر محفوظ ہو گیا جس میں مقامی اقتدار کا سامنا ایک منظم نوآبادیاتی طاقت سے ہوا۔

1843ء میں سندھ کی فتح کے بعد تالپور اقتدار کا حیدرآبادی باب ختم ہو گیا اور سندھ براہِ راست برطانوی اقتدار میں آ گیا۔ تاہم تالپور دور کی تعمیرات، مقبرے، قلعے، کتب، شعری سرمایہ اور ثقافتی روایات آج بھی سندھ کے تاریخی تشخص کا حصہ ہیں۔ حیدرآباد میں تالپوروں کے مقابر، جنہیں ''میرن جا قبا'' کہا جاتا ہے، سندھ کے اہم تاریخی ورثے میں شامل ہیں اور محکمہ آثارِ قدیمہ حکومتِ سندھ نے ان مقامات کو محفوظ تاریخی ورثے کے طور پر درج کیا ہے۔ میر

نصیر خان تالپور کی جدوجہد کو محض جنگِ میانی کی شکست سے تعبیر کرنا ان کی شخصیت اور تاریخی کردار کے ساتھ انصاف نہیں ہو گا۔ ان کی زندگی میں حکمرانی، سیاست، سفارت، علم، شاعری، مذہبی عقیدت، وطن سے وابستگی اور جلاوطنی کے عناصر یکجا ہیں۔ وہ اس عہد کے نمائندہ حکمران تھے جس میں سندھ اپنی سیاسی آزادی کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کی زندگی یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ قوموں کی تاریخ صرف فاتحین کی فتوحات سے نہیں بنتی بلکہ ان لوگوں کی قربانیوں، مزاحمتوں اور تہذیبی خدمات سے بھی تشکیل پاتی ہے جنہوں نے مشکل حالات میں اپنی سرزمین اور شناخت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ میر نصیر خان کی یاد اسی تاریخی شعور کا حصہ ہے۔ آج جب سندھ اپنے ہزاروں سالہ تہذیبی ورثے، زبان، ادب، صوفی روایت اور تاریخی شناخت پر فخر کرتا ہے تو تالپور دور بھی اس ورثے کی ایک اہم کڑی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ میر نصیر خان تالپور کی شخصیت اس دور کی علامت ہے جس نے سندھ کو ایک طرف سیاسی بحران سے دوچار دیکھا اور دوسری طرف علم و ادب، فنون اور تہذیب کے کئی ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی سندھ کی شناخت کو تقویت دیتے ہیں۔ میر نصیر خان تالپور کی تاریخ ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ سندھ کی سرزمین صرف فتوحات کی سرزمین نہیں؛ یہ مزاحمت، علم، تہذیب، وفاداری اور اپنی شناخت کی حفاظت کی بھی سرزمین ہے۔ ان کا نام اسی تاریخی تسلسل میں ایک ایسے حکمران کے طور پر زندہ ہے جس کا عہد سندھ کی خودمختاری کے آخری باب اور اس کے تہذیبی وقار کی ایک اہم داستان بن گیا۔ ■

لیاری، شیدی ورثے کی پہچان، سندھ کی کثیر الثقافتی روح

محمد سلمان

سندھ کی سرزمین صدیوں سے مختلف تہذیبوں، نسلوں، زبانوں اور ثقافتوں کے ملاپ کا مرکز رہی ہے۔ اس دھرتی کی یہی کشادہ دلی ہے کہ یہاں عرب، ایرانی، بلوچ، سندھی، افریقی اور برصغیر کے دیگر خطوں سے آنے والے لوگ وقت کے ساتھ مقامی معاشرے کا حصہ بنتے گئے۔ شیدی یا سِدّی برادری اسی تاریخی اور تہذیبی امتزاج کی ایک نمایاں مثال ہے۔ کراچی کا لیاری اس برادری کی ثقافتی شناخت کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا ہے، جہاں افریقی ورثے، سندھی روایت، بلوچی اثرات، اسلامی روحانیت اور کراچی کے شہری مزاج نے مل کر ایک منفرد ثقافت تشکیل دی ہے۔

شیدی برادری کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ تاریخی حوالوں میں سندھ میں افریقی نژاد افراد کی موجودگی کا ذکر آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کی سندھ آمد کے زمانے سے ملتا ہے۔ 711ء میں محمد بن قاسم کی سندھ آمد کے ساتھ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اس خطے میں پہنچے، جن میں افریقی نژاد سپاہیوں کا ذکر بھی بعض تاریخی روایات میں ملتا ہے۔ ان کے لیے بعض مقامات پر ”زنجی“ کی اصطلاح استعمال ہوئی، جو وسیع تر مشرقی افریقی جغرافیے سے منسوب تھی۔ تاہم موجودہ شیدی آبادی کی تشکیل کو کسی ایک واقعے تک محدود کرنا درست نہیں؛ یہ مختلف ادوار کی ہجرت، تجارت، عسکری خدمات، غلامی اور مقامی معاشرے میں اختلاط کا نتیجہ ہے۔

بحرِ ہند صدیوں تک تجارت اور انسانی نقل و حرکت کا ایک اہم راستہ رہا۔ مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقے، زنجبار، مومباسا، تنزانیہ اور موجودہ کینیا کے بعض حصے عرب دنیا، عمان، ہندوستان اور سندھ کے ساحلی علاقوں سے جڑے ہوئے تھے۔ سترہویں سے انیسویں صدی کے دوران اس سمندری نظام میں غلاموں کی تجارت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ مشرقی افریقہ سے بہت سے افراد عمان اور پھر

برصغیر کے مختلف ساحلی علاقوں تک لائے گئے۔ سندھ اور کراچی بھی اس تاریخی عمل سے متاثر ہوئے۔ دستیاب تاریخی شواہد کے مطابق انیسویں صدی میں کراچی مشرقی افریقہ اور عمان کے درمیان انسانی و تجارتی نقل و حرکت کا ایک اہم مقام بن چکا تھا۔ اس تاریخ کا ایک تاریک پہلو غلامی تھا، جسے جدید انسانی اقدار کی روشنی میں کسی صورت قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ کس طرح غلامی اور جبری نقل مکانی کے انتہائی مشکل تجربے سے گزرنے والی برادریوں نے نئی سرزمینوں میں اپنی شناخت، ثقافت اور عزتِ نفس کو برقرار رکھا۔ سندھ میں شیدی برادری کی داستان بھی اسی انسانی استقامت کی داستان ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ شیدی افراد نے محض گھریلو یا عسکری خدمات تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ برصغیر کی وسیع تاریخ میں افریقی نژاد افراد کے ایسے کردار ملتے ہیں جو غلامی کی حالت سے نکل کر فوجی، انتظامی اور سیاسی مناصب تک پہنچے۔ دکن کے معروف سپہ سالار اور حکمران ملک عنبر اس تاریخی حقیقت کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ ایتھوپیائی نژاد ملک عنبر نے دکن میں غیر معمولی سیاسی و عسکری مقام حاصل کیا اور مغلیہ توسیع کے خلاف اپنی حکمتِ عملی کے باعث تاریخ میں نمایاں مقام بنایا۔ سندھ کی تاریخ میں ہوشو شیدی کا نام بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ 1843ء میں برطانوی قبضے کے خلاف تالپور مزاحمت کے دوران ہوشو شیدی نے جنگِ حیدرآباد میں حصہ لیا اور میدانِ جنگ میں جان قربان کی۔ ان کی شخصیت سندھ کی مزاحمتی تاریخ میں اس حقیقت کی علامت ہے کہ سندھ کی آزادی، خودداری اور سرزمین کے دفاع کی جدوجہد میں مختلف برادریوں کے افراد شریک رہے۔ شیدی برادری کا یہ کردار سندھ کی مشترکہ تاریخ کا حصہ ہے۔

لیاری جہاں ڈھول کی تھاپ تاریخ سناتی ہے۔ اگر کراچی کو مختلف ثقافتوں کا شہر کہا جائے تو لیاری اس شہر کی تہذیبی روح کا ایک اہم باب ہے۔ لیاری کی شناخت صرف اس کی گلیوں، بازاروں، کھیلوں یا سماجی زندگی تک محدود نہیں بلکہ یہاں مختلف برادریوں کے باہمی میل جول نے ایک منفرد شہری ثقافت تشکیل دی ہے۔ شیدی برادری اس ثقافتی منظرنامے میں اپنے مخصوص موسیقی، رقص، روحانی رسومات اور اجتماعی تقریبات کے ذریعے نمایاں ہے۔ لیاری میں شیدی ثقافت کا سب سے دلکش پہلو ڈھول کی تھاپ ہے۔ مخصوص تال، اجتماعی رقص اور موسیقی کے ذریعے شیدی برادری نے اپنے تاریخی افریقی ورثے کو زندہ رکھا ہے۔ یہ موسیقی محض تفریح نہیں بلکہ شناخت کا اظہار بھی ہے۔ نسل در نسل منتقل ہونے والی تالیں، رقص کے انداز اور اجتماعی تقریبات ایک ایسے ماضی سے رشتہ قائم رکھتے ہیں جو سمندر پار افریقہ سے شروع ہو کر سندھ کی سرزمین پر نئی شکل اختیار کر گیا۔

شیدی ثقافتی اظہار میں افریقی عناصر اور مقامی روایات کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ افریقی موسیقی کی تال، سندھ کی صوفی روایت، بلوچی سماجی اثرات اور کراچی کے شہری ماحول نے مل کر ایک ایسا ثقافتی رنگ پیدا کیا ہے جو نہ مکمل طور پر افریقی ہے، نہ صرف سندھی یا بلوچی؛ بلکہ یہ سب رنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ایک منفرد سندھی شہری ثقافت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لیاری کو بعض تحریروں میں کراچی کا "لٹل افریقہ" بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کو صرف ظاہری رنگ و نسل کے حوالے سے دیکھنا اس ثقافت کی گہرائی کو محدود کر دیتا ہے۔ لیاری کی شیدی شناخت دراصل صدیوں کے میل جول، مقامی معاشرے میں شمولیت اور ثقافتی تبادلے کی داستان ہے۔ آج بہت سے شیدی افراد خود کو بیک وقت افریقی النسل، سندھی، بلوچی، مکرانی اور کراچی کا شہری سمجھتے ہیں۔ یہ متعدد شناختیں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں بلکہ سندھ کے کثیر الثقافتی مزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔

شیدی برادری کی ثقافتی زندگی میں مذہبی اور روحانی روایات بھی اہم مقام رکھتی ہیں۔ اسلامی عقیدے کے ساتھ صوفیانہ روایت

نے اس برادری کی اجتماعی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ حضرت بلال حبشیؓ سے نسبت بھی بہت سے افریقی النسل مسلمانوں کے لیے روحانی اور تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت بلالؓ اسلام کے ابتدائی دور کی عظیم شخصیات میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر ایمان، مساوات، وفاداری اور انسانی وقار کی علامت بن چکی ہے۔ سندھ کے صوفی مزاج نے بھی شیدی برادری کو مقامی ثقافت کے ساتھ مضبوطی سے جوڑا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، لعل شہباز قلندر اور دیگر صوفی بزرگوں کی تعلیمات نے سندھ میں مختلف طبقات اور برادریوں کو ایک مشترکہ روحانی فضا فراہم کی۔ شیدی برادری کی بعض روحانی تقریبات میں کلام، ذکر، ڈھول اور اجتماعی حرکات ایک دوسرے کے ساتھ جڑے نظر آتے ہیں۔ یہ روایت اس بات کی مثال ہے کہ سندھ میں مذہب اور ثقافت نے کئی مواقع پر ایک دوسرے کو تقویت دی ہے۔ ثقافت جو نسلوں کو جوڑتی ہے۔ شیدی برادری کی سب سے بڑی طاقت اس کی ثقافتی یادداشت ہے۔ جب ایک نسل دوسری نسل کو ڈھول کی تال، رقص کے انداز، لوک روایت، بزرگوں کی داستانیں اور برادری کی تاریخ منتقل کرتی ہے تو دراصل وہ اپنی شناخت کو آنے والے وقت کے حوالے کرتی ہے۔ یہی ثقافتی تسلسل کسی بھی معاشرے کو زندہ رکھتا ہے۔

لیاری کے محلے، گلیاں اور اجتماعی تقریبات اس عمل کے خاموش گواہ ہیں۔ یہاں ڈھول کی آواز صرف ایک موسیقی کی آواز نہیں؛ یہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک پل ہے۔ اس تھاپ میں افریقہ کے ساحلوں کی یاد بھی محسوس ہوتی ہے، بحرِ ہند کے سمندری راستوں کی بازگشت بھی یاد آتی ہے، سندھ کی مٹی کی خوشبو بھی اور کراچی کے شہری مزاج کی توانائی بھی اس تھاپ میں محسوس ہوتی ہے۔ شیدی برادری نے کھیل، محنت، موسیقی، سماجی خدمت، کاروبار اور مختلف پیشوں میں بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر لیاری کی کھیلوں کی ثقافت نے کئی نوجوانوں کو قومی سطح پر اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح شیدی برادری کی شناخت صرف ماضی کی داستان نہیں بلکہ موجودہ پاکستان کی سماجی زندگی میں فعال شرکت کا نام بھی ہے۔

سندھ کی اصل طاقت اس کی کثرت میں وحدت ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف ثقافتی پس منظر رکھنے والے اور مختلف تاریخی تجربات کے حامل لوگ صدیوں سے آباد ہیں۔ شیدی برادری اسی وسیع سندھی تہذیب کا ایک اہم جز ہے۔ ان کی موجودگی سندھ کے اس تاریخی کردار کو اجاگر کرتی ہے جس نے بیرونی دنیا سے آنے والے لوگوں کو صرف جگہ ہی نہیں دی بلکہ انہیں اپنے تہذیبی دائرے میں بھی شامل کیا۔ شیدی برادری کی تاریخ کو محض غلامی یا افریقی نسبت کے محدود زاویے سے نہ دیکھا جائے بلکہ اسے سندھ کی مشترکہ تاریخ کے ایک مکمل باب کے طور پر سمجھا جائے۔ ان کی جدوجہد، محنت، قربانیاں، موسیقی، روحانی روایات اور ثقافتی ورثہ سندھ کی اجتماعی شناخت کا حصہ ہیں۔ لیاری کی گلیوں میں جب ڈھول بجتا ہے اور نوجوان و بزرگ ایک مخصوص تال پر ثقافتی رقص میں شریک ہوتے ہیں تو یہ منظر دراصل ایک زندہ تاریخ بن جاتا ہے۔ ڈھول کی ہر تھاپ صدیوں کے سفر، ہجرت، جدوجہد اور ثقافتی بقا کی کہانی سناتی ہے۔ یہ تھاپ بتاتی ہے کہ ثقافت صرف کتابوں اور عجائب گھروں میں محفوظ نہیں ہوتی؛ وہ لوگوں کے طرزِ زندگی، موسیقی، زبان، رقص، لباس، رسومات اور اجتماعی یادداشت میں سانس لیتی ہے۔ شیدی برادری کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ انسان جہاں بھی جائے، اپنی یادوں اور ثقافتی ورثے کو نئی سرزمین کے رنگوں کے ساتھ ملا کر ایک نئی شناخت تخلیق کر سکتا ہے۔ سندھ نے شیدی برادری کو جگہ دی اور شیدی برادری نے اپنی محنت، وفاداری، ثقافت اور قربانیوں سے سندھ کے تہذیبی دامن کو مزید وسیع کیا۔ آج لیاری کی ثقافتی فضا میں گونجتی ہوئی ڈھول کی تھاپ صرف ایک برادری کی آواز نہیں بلکہ سندھ کی کثیر الثقافتی روح کی آواز ہے۔ یہ آواز ہمیں یاد دلاتی ہے کہ سندھ کی اصل پہچان محبت، برداشت، ثقافتی تنوع اور انسان کو انسان سمجھنے کی روایت ہے۔ شیدی برادری اس روایت کا ایک خوب صورت، زندہ اور قابلِ فخر باب ہے۔■

عالمی یومِ خواندگی
سندھ میں تعلیم و شعور کے فروغ کا عزم

سید عامر حسین

عالمی یومِ خواندگی ہر سال 8 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خواندگی صرف کسی شخص کا پڑھ اور لکھ لینا نہیں بلکہ اسے اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھنے، سوال کرنے، درست فیصلے کرنے، اپنے حقوق سے آگاہ ہونے اور معاشی و سماجی مواقع سے فائدہ اٹھانے کے قابل بنانا بھی ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں خواندگی کا تصور مزید وسیع ہو چکا ہے۔ روایتی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت کے ساتھ ڈیجیٹل خواندگی، مالیاتی شعور، سائنسی سوچ، معلومات کی صحت و درستگی کو جانچنے کی صلاحیت اور جدید ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال کی اہلیت بھی تعلیم کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔

پاکستان میں HIES 2024-25 کے مطابق 10 سال اور اس سے زائد عمر کی آبادی کی مجموعی شرحِ خواندگی 63 فیصد ہے۔ تاہم تعلیمی عدم مساوات اب بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ 5 سے 16 سال کی عمر کے بچوں میں ملک بھر میں 28 فیصد اسکول سے باہر ہیں، جبکہ سندھ میں یہ شرح 39 فیصد ہے۔ دیہی سندھ میں صورتِ حال مزید توجہ طلب ہے جہاں 51 فیصد بچے اسکول سے باہر ہیں۔ یہ اعداد و شمار ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ سندھ میں خواندگی کا مشن محض تعلیمی پالیسی نہیں بلکہ ایک وسیع سماجی ذمہ داری ہے۔

سندھ کے لیے یہ ذمہ داری اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ خطہ برصغیر کی قدیم ترین تہذیبوں، علمی مراکز اور فکری روایات کا امین رہا ہے۔ موئن جو دڑو کی شہری تہذیب سے لے کر ٹھٹھہ کے علمی مراکز، مدارس، صوفی خانقاہوں اور جدید جامعات تک سندھ نے علم کی مختلف شکلوں کو اپنے اندر سمویا ہے۔ یہاں علم صرف خواص تک محدود نہیں رہا بلکہ صوفی شاعری، لوک ادب، داستانوں اور عوامی روایت کے ذریعے عام لوگوں تک بھی پہنچا۔

سندھ کی علمی تاریخ میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، مخدوم محمد معین، خواجہ محمد زمان اور دیگر اہلِ علم و دانش کا کردار غیر معمولی ہے۔ ان شخصیات نے اپنے اپنے عہد میں علم، اخلاق، روحانیت، زبان، ادب اور انسانی شعور کو فروغ دیا۔ ان کی خدمات کا ایک مشترکہ پہلو یہ تھا کہ انہوں نے علم کو زندگی سے جدا نہیں سمجھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اس روایت کی سب سے روشن مثال

ہیں۔ شاہ لطیف نے سندھ کے عوام کی زبان میں ایسی شاعری تخلیق کی جس میں محبت، انسان دوستی، محنت، ہمت، آزادی، عورت کے کردار، وطن سے وابستگی اور روحانی جستجو جیسے موضوعات شامل ہیں۔ سسی، ماروی، نوری اور مومل جیسے کرداروں کے ذریعے انہوں نے انسانی زندگی کے گہرے مسائل کو عام فہم زبان میں بیان کیا۔ یوں ان کا کلام محض شاعری نہیں رہا بلکہ سندھ کے اجتماعی شعور اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بن گیا۔

سچل سرمست نے سندھ کی فکری روایت میں ایک اور منفرد رنگ پیدا کیا۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی، محبت، رواداری اور وحدت کا تصور نمایاں ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں میں اظہار کر کے یہ ثابت کیا کہ علم اور فکر کسی ایک زبان، قوم یا طبقے کی ملکیت نہیں۔ ان کا کلام سندھ کی کثیر الثقافتی اور وسیع النظر شناخت کا ترجمان ہے۔

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے تاریخ، ادب اور تذکرہ نگاری کے ذریعے سندھ کے علمی ورثے کو محفوظ کیا۔ ان کا کام آنے والی نسلوں کے لیے تاریخی حافظے کا اہم ذریعہ بنا۔ اسی طرح مرزا قلیچ بیگ نے جدید سندھ میں علم و ادب کی کئی جہتوں کو فروغ دیا۔ وہ ادیب، مترجم، مؤرخ، محقق اور زبان کے خادم تھے۔ انہوں نے سندھی نثر کو جدید اسلوب سے روشناس کیا اور دنیا کے علمی و ادبی سرمائے کو سندھی زبان میں منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سندھ کی جدید تعلیمی بیداری میں خان بہادر حسن علی افندی کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کا قیام جدید تعلیم کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل تھا۔ اس ادارے نے ایسے طلبہ کی تربیت کی جنہوں نے بعد میں برصغیر کی سیاسی، علمی اور سماجی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی سندھ مدرسۃ الاسلام کے طالب علم رہے۔ سندھ کے تعلیمی منظرنامے میں اس ادارے کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

سندھ کی جدید تعلیمی روایت مختلف طبقات کی مشترکہ کاوشوں سے تشکیل پائی۔ ڈی جے سندھ کالج جیسے اداروں نے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھولے جبکہ بعد کے دور میں سندھ یونیورسٹی، جامعہ کراچی اور دیگر جامعات نے تحقیق اور اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا۔ یہ سندھ کی اس منفرد روایت کی علامت ہے جس میں مختلف مذہبی، لسانی اور سماجی پس منظر رکھنے والے افراد نے علم کے فروغ میں حصہ لیا۔

علامہ آئی آئی قاضی سندھ کی فکری تاریخ کے ایک ایسے دانشور تھے جنہوں نے فلسفہ، تعلیم، تصوف اور انسانی فکر کو باہم مربوط کیا۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف ملازمت حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک باشعور، اخلاقی اور متوازن انسان پیدا کرنا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر عمر بن محمد دائود پوتہ نے عربی، فارسی، سندھی اور اسلامی علوم میں گراں قدر تحقیق کر کے سندھ کو وسیع علمی دنیا سے جوڑا۔

محمد ابراہیم جویو نے تعلیم، ادب، ترجمہ اور فکری آزادی کے میدان میں طویل جدوجہد کی۔ ان کی شخصیت اس تصور کی نمائندہ تھی کہ تعلیم کسی معاشرے کی فکری آزادی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ انہوں نے سندھی معاشرے میں جدید فکر، سائنسی طرزِ سوچ اور علم کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے قلم کو ذریعہ بنایا۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے سندھ کی علمی اور ثقافتی تاریخ کو ایک منفرد انداز میں محفوظ کیا۔ انہوں نے سندھ کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا، لوک ادب، لوک داستانوں، زبان، موسیقی اور عوامی دانش کو جمع کیا اور اسے تحقیقی بنیادوں پر محفوظ کیا۔ ان کی خدمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ خواندگی کا مطلب صرف نصابی کتاب پڑھنا نہیں بلکہ اپنی تہذیب، زبان اور اجتماعی یادداشت کو سمجھنا بھی ہے۔

آج سندھ حکومت کے لیے خواندگی کا مشن اسی تاریخی تسلسل کو جدید تقاضوں سے جوڑنے کا نام ہے۔ حکومت سندھ نے تعلیم کو اپنی ترجیحات میں شامل رکھتے ہوئے مفت درسی کتب، طالبات کے وظائف، اسکول مخصوص بجٹ، ڈیجیٹل لرننگ، اسکولوں کی بحالی، اساتذہ کی تربیت اور غیر رسمی تعلیم جیسے مختلف اقدامات جاری رکھے ہیں۔ محکمہ اسکول ایجوکیشن اینڈ لٹریسی کے مطابق حکومت مفت اور لازمی تعلیم کے آئینی و قانونی عزم کے

تحت پانچ سے سولہ سال کی عمر کے بچوں تک تعلیم کی رسائی بڑھانے پر کام کر رہی ہے۔

مالی سال 27-2026ء میں سندھ حکومت نے اسکول، کالج، جامعات اور بورڈز کے لیے مجموعی طور پر تقریباً 497.8 ارب روپے کی بجٹ تجاویز پیش کیں، جن میں اسکول ایجوکیشن کے لیے تقریباً 447 ارب روپے مختص کیے گئے۔ اسکول مخصوص بجٹ کو بھی تقریباً 18.67 ارب روپے سے بڑھا کر 22.64 ارب روپے کیا گیا۔ مفت درسی کتب کے لیے 5 ارب روپے رکھے گئے، جبکہ اسکول سے باہر بچوں کو تعلیم کے دائرے میں لانے اور غیر رسمی تعلیم کے پروگراموں کو وسعت دینے کے لیے 1.5 ارب روپے مختص کیے گئے۔ یہ بھی اہم ہے کہ حکومت نے تعلیمی معیار کو محض اسکول میں داخلے تک محدود رکھنے کے بجائے بنیادی سیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ سیلیکٹ منصوبے کے تحت سندھ کے 12 اضلاع کے سرکاری پرائمری اسکولوں میں جماعت اول تا پنجم روزانہ باقاعدہ پڑھنے کا دورانیہ متعارف کرانے کی ہدایت دی گئی، جس کا مقصد ابتدائی جماعتوں میں پڑھنے اور فہم کی صلاحیت بہتر بنانا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم بھی سندھ کے مستقبل کی بنیادی ضرورت ہے۔ حکومت سندھ کی جانب سے طالبات کے وظائف کا نظام جاری ہے اور 26-2025ء کے لیے گرلز اسٹائپنڈ کے اہلیت کے معیار بھی نوٹیفائی کیے گئے ہیں۔ ایسے اقدامات خصوصاً کم آمدنی والے خاندانوں میں بچیوں کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جدید دور میں صرف روایتی تعلیم کافی نہیں۔ سندھ حکومت کے تعلیمی منصوبوں میں ڈیجیٹل لرننگ، اسٹریم تعلیم، ٹیکنالوجی اور عملی مہارتوں پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔ بجٹ دستاویزات میں مڈل ٹیک لیبز اور اسٹریم لیبز جیسے اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا مقصد طلبہ میں مسئلہ حل کرنے، تخلیقی سوچ، ڈیجیٹل خواندگی اور علم سیکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔

سندھ کی موجودہ تعلیمی پالیسی کے لیے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ہم اسکول میں داخل ہونے والے بچے کو حقیقی معنوں میں سیکھنے والا بچہ کیسے بنائیں۔ صرف داخلہ بڑھانا کافی نہیں؛ ضروری ہے کہ بچہ پڑھ سکے، لکھی ہوئی عبارت سمجھ سکے، بنیادی حساب کر سکے، سوال پوچھ سکے اور اپنی زندگی سے متعلق فیصلے کرنے کے قابل ہو۔ اسی طرح اساتذہ کی تربیت، اسکول کی عمارت، صاف پانی، واش روم، بجلی، محفوظ ماحول، کتابیں اور ٹیکنالوجی بھی معیاری تعلیم کے لازمی اجزا ہیں۔

عالمی یومِ خواندگی ہمیں اسی ورثے کی روشنی میں مستقبل کا عہد کرنے کا موقع دیتا ہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کا یہ پیغام کہ خواندگی انسانی حق اور معاشرتی ترقی کی بنیاد ہے، اس وقت حقیقی معنویت اختیار کرے گا جب سندھ کا ہر بچہ اسکول تک پہنچے، ہر بچی اپنی تعلیم مکمل کر سکے، ہر نوجوان جدید ہنر حاصل کرے اور ہر بالغ فرد بنیادی خواندگی سے بہرہ مند ہو۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے عالمی یومِ خواندگی کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ خواندگی ہر انسان کا بنیادی حق اور معاشرے کی ترقی کی بنیاد ہے۔ لوگوں کو بااختیار بنانے، معاشی مواقع بڑھانے اور سماجی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں خواندگی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان کا یہ پیغام سندھ کی اس عظیم علمی روایت سے بھی ہم آہنگ ہے جس میں صدیوں سے علم، ادب، تحقیق، فلسفہ، تصوف اور انسانی شعور کو معاشرتی ترقی کا بنیادی وسیلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ سندھ کی علمی تاریخ ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ یہ سرزمین علم کی پیاسی نہیں، علم کی امین ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ماضی کی علمی عظمت کو آج کی تعلیمی ضرورت اور آنے والے کل کی ٹیکنالوجی سے جوڑ دیا جائے۔ جب کتاب اور ٹیکنالوجی، روایت اور تحقیق، زبان اور جدید علم، اسکول اور معاشرہ ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے تو خواندگی محض ایک شماریاتی ہدف نہیں رہے گی بلکہ سندھ کی سماجی تبدیلی کی سب سے طاقتور قوت بن جائے گی۔ یہی عالمی یومِ خواندگی کا حقیقی پیغام اور یہی ایک تعلیم یافتہ، بااختیار اور روشن سندھ کی بنیاد ہے۔■

محمد ابراہیم جویو، سندھ کی فکری بیداری، سندھی زبان اور علمی جدوجہد کا روشن استعارہ

سلمان احمد

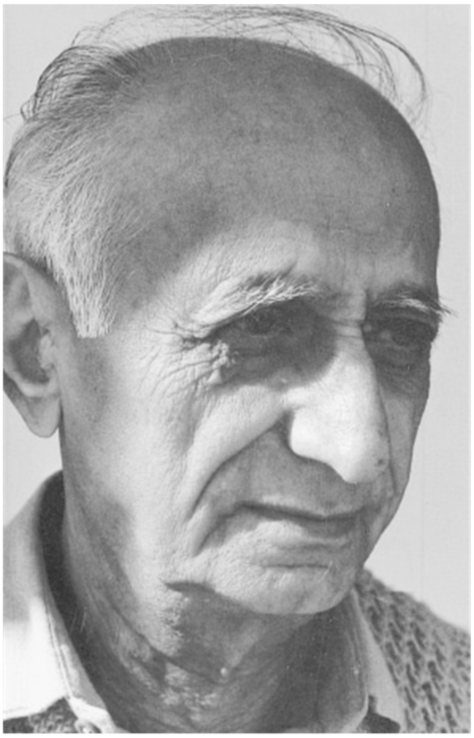

محمد ابراہیم جویو سندھ کی ان عظیم علمی و ادبی شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی علم، تعلیم، ادب، زبان اور سماجی شعور کے فروغ کے لیے وقف کردی۔ وہ محض ایک ادیب، مترجم یا استاد نہیں تھے بلکہ ایک عہد ساز دانشور تھے جنہوں نے سندھ کی تین سے زائد نسلوں کی فکری تربیت کی۔ ان کی جدوجہد کا بنیادی محور سندھ کی ترقی، سندھی زبان و ادب کا تحفظ، جدید تعلیم کا فروغ، نوجوان نسل میں تنقیدی شعور پیدا کرنا اور معاشرے میں علم و آگہی کو عام کرنا تھا۔ ان کی شخصیت سندھ کی جدید فکری تاریخ میں ایک ایسے چراغ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی روشنی آج بھی سندھی ادب، تعلیم اور سماجی فکر میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

محمد ابراہیم جویو 13 اگست 1915ء کو سابق ضلع دادو اور موجودہ ضلع جامشورو کے گاؤں آباد میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن غربت میں گزرا، مگر مشکلات ان کے عزم کو متزلزل نہ کرسکیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سن کے اے۔ وی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے 1934ء میں میٹرک کا امتحان نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اور اسکالرشپ حاصل کی۔ 1938ء میں ڈی جے سندھ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر گربخشانی، بھیرومل مہرچند آڈوانی اور منگھارام ملکاݨي جیسے نامور اہل علم شامل تھے۔ 1940ء میں وہ بمبئی گئے جہاں انہوں نے تدریسی تربیت حاصل کی اور واپسی پر سندھ مدرسۃ الاسلام میں استاد مقرر ہوئے۔

تعلیم کو سماجی تبدیلی کا ذریعہ سمجھنے والا استاد: ابراہیم جویو کے نزدیک تعلیم محض ملازمت حاصل کرنے یا امتحان پاس کرنے کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ انسان اور معاشرے کی تعمیر کا بنیادی وسیلہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس کے عوام کو معیاری اور اپنی زبان میں تعلیم کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ اسی لیے ان کی فکری جدوجہد میں تعلیم اور مادری زبان کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انہوں نے سندھی زبان میں درسی اور تعلیمی مواد کی تیاری میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ "سنڌي پهريون ڪتاب"، "سنڌي ٻيو ڪتاب" اور "سنڌي ٽيون ڪتاب" سمیت مختلف تعلیمی کتابیں ان کے تعلیمی وژن کی

عکاسی کرتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کو ابتدائی سطح ہی سے اپنی زبان میں معیاری اور بامقصد تعلیم فراہم کی جائے۔ ان کی نظر میں مادری زبان میں تعلیم بچے کے ذہنی اور تخلیقی ارتقا کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی مرتب کردہ اور نظر ثانی شدہ کتاب "The Sindhi Instructor" بھی سندھی زبان کی تدریس کے حوالے سے ان کی خدمات کا ثبوت ہے۔

سندھی زبان کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد: محمد ابراہیم جویو کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو سندھی زبان کے لیے ان کی مسلسل جدوجہد ہے۔ وہ زبان کو محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ قوم کی تاریخی یادداشت، ثقافت، تہذیب اور اجتماعی شناخت سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے سندھی زبان کو تعلیم، ادب، تحقیق اور علمی مکالمے کی زبان بنانے کے لیے عملی کام کیا۔ انہوں نے سندھی زبان کے علمی ذخیرے کو وسعت دینے کے لیے لغت، نصاب، تراجم اور ادبی مواد کی تیاری میں حصہ لیا۔ "سنڌي ٻوليءَ جي بنيادي لغت" کی تیاری بھی اسی علمی کوشش کا حصہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ زبان اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس میں جدید علوم، فلسفہ، سیاست، سماجیات اور انسانی فکر کے مختلف موضوعات پر معیاری مواد دستیاب ہو۔ انہوں نے سندھی ادبی اداروں اور تنظیموں کے قیام و استحکام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سندھ ادبی بورڈ کے ساتھ ان کی طویل وابستگی نے سندھی ادب کی اشاعت اور فروغ کو نئی سمت دی۔ وہ سندھ ادبی بورڈ کے سیکریٹری بھی رہے اور طویل عرصے تک سندھی علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے رہے۔

"سندھ بچاؤ، برصغیر بچاؤ" اور فکری مزاحمت: ابراہیم جویو کی فکری زندگی میں "Save Sindh, Save the Continent: From Feudal Lords, Capitalists and their Communalisms" ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب 1940ء کی دہائی میں سامنے آئی اور اس میں انہوں نے سندھ کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کتاب کی وجہ سے انہیں سرکاری اور انتظامی دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑا اور سندھ مدرسے میں ان کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے تدریس کے دوسرے شعبوں میں کام جاری رکھا۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت تھا کہ جویو صاحب اپنے خیالات کے اظہار میں مصلحت سے زیادہ اصول کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دانشور کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ معاشرے کے مسائل کی نشاندہی کرے، سوال اٹھائے اور عوام کو سوچنے پر مجبور کرے۔

مترجم کی حیثیت سے عالمی فکر کو سندھ تک پہنچایا: محمد ابراہیم جویو کی سب سے بڑی علمی خدمات میں ان کا فنِ ترجمہ بھی شامل ہے۔ انہوں نے دنیا کے اہم فلسفیوں، ادیبوں، مفکرین اور ماہرین تعلیم کی تحریروں کو سندھی زبان میں منتقل کر کے سندھی قارئین کو عالمی علمی و فکری سرمائے سے روشناس کرایا۔ انہوں نے روسو، والٹیئر، پاؤلو فریرے، شیلی، ٹیگور اور دیگر عالمی مفکرین و ادیبوں کے کام کا ترجمہ کیا۔ ان کے تراجم میں "اسلام جو تاريخي ڪارنامو"، "ايميلي عرف تعليم"، "ٻارن جي تعليم"، "فڪر جي آزادي"، "گليلو"، "فلسفي جو ابتدائي ڪورس" اور پاؤلو فریرے کی معروف کتاب "Pedagogy of the Oppressed" کا سندھی ترجمہ "علم تدریس مظلومن لاءِ" شامل ہیں۔ یہ تراجم محض زبان کی تبدیلی نہیں تھے بلکہ ایک فکری تحریک تھے۔ جویو صاحب نے عالمی خیالات کو سندھی زبان میں منتقل کر کے یہ ثابت کیا کہ سندھی زبان جدید فلسفے، سیاسی فکر، تعلیم، سماجیات اور انسانی حقوق جیسے پیچیدہ موضوعات کو بیان کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

شاہ لطیف، سچل اور سامی کی فکری روایت: محمد ابراہیم جویو نے سندھ کے کلاسیکی صوفی اور فکری ورثے کو بھی جدید تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کی کتاب "شاہ، سچل، سامي" میں سندھ کے تین عظیم صوفی شعرا کی فکری اور سماجی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ اسی طرح "سندھ کے صوفی شاعر" کے نام سے ان کی کتاب اردو میں بھی شائع ہوئی، جس میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور سامی کے عہد کے سیاسی، تہذیبی اور معاشی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ان کے نزدیک سندھ کی صوفی روایت محض روحانی شاعری

نہیں تھی بلکہ انسان دوستی، برداشت، محبت، آزادیِ فکر اور سماجی برابری کا پیغام بھی اپنے اندر رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاہ لطیف اور دیگر صوفی شعرا کو سندھ کی اجتماعی فکری شناخت کا اہم حصہ سمجھتے تھے۔

شیخ ایاز اور نئی نسل کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی: محمد ابراہیم جویو نے صرف اپنی کتابیں نہیں لکھیں بلکہ دوسرے اہلِ قلم کی علمی و ادبی کاوشوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ خصوصاً شیخ ایاز کے کئی اہم کاموں کے لیے مقدمے اور پیش لفظ لکھے۔ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر مقدمے لکھ کر انہوں نے نئی نسل کے قلم کاروں کی رہنمائی کی۔ سندھ میں ''مقدمہ نویسی'' کے فن کے استاد کی حیثیت سے بھی ان کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اثر ان کی اپنی تصانیف سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو انہوں نے پڑھا، ان کی حوصلہ افزائی کی یا جن کے کام کا تعارف کرایا، ان سب کے ذریعے ان کی فکری میراث آگے منتقل ہوتی رہی۔

ابراہیم جویو نے علمی و ادبی ادارہ سازی کو بھی سندھ کی ترقی کا بنیادی ذریعہ سمجھا۔ انہوں نے سندھ رائٹرز کوآپریشن فریٹرنٹی، سندھ فرینڈز سرکل، سرونٹس آف سندھ سوسائٹی، سندھ ایجوکیشن ٹرسٹ اور شیخ ایاز فاؤنڈیشن جیسے اداروں کے قیام یا فروغ میں کردار ادا کیا۔ سندھ لینگویج اتھارٹی کے قیام سے متعلق کوششوں میں بھی ان کا کردار اہم تھا۔

ان اداروں کا بنیادی مقصد علم، ادب، تعلیم، زبان اور ثقافت کے لیے اجتماعی بنیاد فراہم کرنا تھا۔ جویو صاحب اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ کسی ایک فرد کی کوشش محدود ہو سکتی ہے، لیکن ادارہ نسلوں تک کام جاری رکھ سکتا ہے۔

سندھ کے لیے ان کی جدوجہد کا وسیع مفہوم: محمد ابراہیم جویو کی سندھ دوستی کسی محدود یا وقتی تصور کا نام نہیں تھی۔ ان کے نزدیک سندھ کی ترقی کا راستہ علم، تعلیم، معاشی انصاف، سماجی شعور، ثقافتی شناخت اور مادری زبان کے فروغ سے گزرتا تھا۔ انہوں نے جاگیرداری، جہالت، سماجی ناانصافی اور فکری جمود پر تنقید کی اور عوام کو جدید علم سے جوڑنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی طویل زندگی میں 50 سے زائد کتابیں تحریر کیں جبکہ درجنوں اہم کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ ریڈیو پاکستان کے مطابق ان کی کتابوں کی تعداد 52 تک بتائی گئی ہے، جن میں 32 ترجمہ شدہ کتب شامل تھیں۔ ان کے مضامین، خطوط، کتابچے اور ادبی مقدمات اس کے علاوہ ہیں۔

ایک عہد ساز شخصیت کا روشن ورثہ: محمد ابراہیم جویو 9 نومبر 2017ء کو حیدرآباد میں 102 برس کی عمر میں انتقال کر گئے، مگر ان کی فکری زندگی آج بھی زندہ ہے۔ انہیں 2010ء میں صدرِ پاکستان کی جانب سے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' سے بھی نوازا گیا۔

ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ قوموں کی تعمیر صرف سیاسی نعروں سے نہیں بلکہ تعلیم، کتاب، زبان، تحقیق اور مسلسل فکری جدوجہد سے ہوتی ہے۔ محمد ابراہیم جویو نے سندھ کے لیے قلم کو ہتھیار، کتاب کو چراغ اور تعلیم کو تبدیلی کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے سندھی زبان کو جدید دنیا کے علمی افکار سے جوڑنے، سندھی ادب کو وسعت دینے اور نئی نسل کو سوال کرنے، سوچنے اور سیکھنے کی ترغیب دینے میں جو کردار ادا کیا، وہ سندھ کی علمی تاریخ کا مستقل حصہ ہے۔ آج جب دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور زبانیں، ثقافتیں اور مقامی شناختیں نئے چیلنجز سے دوچار ہیں، محمد ابراہیم جویو کا پیغام مزید اہم ہو جاتا ہے۔ ان کی جدوجہد اس بات کی یاد دہانی ہے کہ اپنی زبان سے محبت کا مطلب صرف اسے بولنا نہیں بلکہ اسے علم، تحقیق، تعلیم، ادب اور جدید فکر کی زبان بنانا بھی ہے۔ محمد ابراہیم جویو نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک کتاب، قلم، تعلیم اور سندھ سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ وہ سندھ کے صرف ایک ادیب نہیں تھے؛ وہ سندھ کی فکری بیداری کے معمار، سندھی زبان کے محافظ، تعلیم کے داعی اور نئی نسل کے استاد تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز شاید یہی ہے کہ ان کی فکر آج بھی کتابوں، زبان، اداروں اور ان نسلوں میں زندہ ہے جنہیں انہوں نے علم کی روشنی سے روشناس کرایا۔

■

سید میر محمد معصوم بکھری
سندھ کا مورخ، شاعر اور علمی ورثے کا امین

دیبا پروین

سندھ کی تاریخ، تہذیب، ادب اور علمی روایت میں بعض شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والی نسلوں کے لیے ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو آج بھی تحقیق کا بنیادی حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ سید میر محمد معصوم بکھری انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ صرف ایک مورخ نہیں تھے بلکہ شاعر، خطاط، کاتب، عالم، طبیب، سپہ سالار، سفارت کار اور تعمیرات کے سرپرست بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں علم و ادب، انتظامی بصیرت، فنونِ لطیفہ اور سندھ سے گہری وابستگی ایک ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تاریخ معصومی" ہے، جو سندھ کی قدیم تاریخ کے اہم فارسی ماخذوں میں شمار ہوتی ہے۔

میر محمد معصوم بکھری کا تعلق بکھر، موجودہ سکھر کے تاریخی خطے سے تھا۔ مغلیہ عہد میں انہوں نے علمی اور انتظامی میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اکبر کے عہد میں ان کی صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور وہ دربار سے وابستہ اہم شخصیات میں شمار ہوئے۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو سپاہی اور سفارت کار کا بھی تھا، جس کی وجہ سے انہیں سندھ اور برصغیر کے مختلف سیاسی حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میر معصوم کی سب سے بڑی علمی شناخت "تاریخ معصومی" ہے۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی اور سندھ کی تاریخ کے قدیم ترین اہم ماخذوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں سندھ کے قدیم ادوار سے لے کر مغلیہ اقتدار کے قیام تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مصنف نے اپنے عہد کے سیاسی حالات، حکمرانوں، اہم شخصیات اور سندھ کے مختلف علاقوں کے بارے میں معلومات محفوظ کیں۔

"تاریخ معصومی" بظاہر میر معصوم نے اپنے صاحبزادے میر بزرگ کی علمی رہنمائی کے لیے مرتب کی، لیکن اس کا دائرۂ کار ذاتی تربیت سے کہیں وسیع ہو گیا۔ اس میں سندھ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ مقامی حالات اور ارغونی دور کی متعدد اہم شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اسی لیے سندھ کے مورخین کے نزدیک یہ کتاب ایک بنیادی تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعد

کے ادوار میں اس کتاب پر متعدد اہلِ علم نے تحقیقی کام کیا۔ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ نے اس کے فارسی متن کی تدوین و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا، جبکہ پیر حسام الدین راشدی نے میر محمد معصوم بکھری کی شخصیت اور علمی خدمات پر جامع تحقیق کی۔ سندھی ادبی بورڈ نے بھی "تاریخ معصومی" کو مختلف ادوار میں شائع کیا، جس سے اس علمی ورثے کو نئی نسل تک پہنچانے میں مدد ملی۔ میر محمد معصوم بکھری کی شخصیت کا ایک اہم مگر نسبتاً کم زیرِ بحث پہلو ان کی شاعری ہے۔ وہ فارسی زبان کے صاحبِ ذوق شاعر تھے اور ان کے ادبی سرمائے میں فارسی شاعری کے دیوان اور رباعیات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اس علمی روایت کے نمائندہ تھے جس میں ایک ہی شخصیت تاریخ، ادب، خطاطی، طب اور دیگر علوم میں بیک وقت مہارت رکھتی تھی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی فارسی شعری روایت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس دور کے فارسی ادب میں عشق، فراق، زندگی کی ناپائیداری، اخلاق، تصوف، معرفت اور انسانی جذبات بنیادی موضوعات تھے۔ میر معصوم بھی اسی ادبی ماحول کے پروردہ تھے۔ ان کے کلام میں فارسی غزل کی نزاکت، رباعی کی فکری اختصاریت اور کلاسیکی شعری اظہار کی پختگی کا انداز ملتا ہے۔

ان کے ایک شعر کا حوالہ ریختہ پر بھی موجود ہے:

"آج اک اور برس بھی تو بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے"

اس شعر میں فراق اور گزرتے ہوئے وقت کا احساس نمایاں ہے۔ شاعر ایک ایسے محبوب یا عزیز کی عدم موجودگی کو محسوس کرتا ہے جس کی موجودگی میں اس کی دنیا آباد تھی۔ اس مختصر شعر میں یاد، تنہائی اور وقت کے گزرنے کا گہرا احساس موجود ہے۔ میر معصوم کی شاعری کو ان کی تاریخی شخصیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ایک مورخ کی نگاہ زمانے کے تغیرات پر ہوتی ہے اور ایک شاعر کی نظر انسانی دل کی کیفیتوں پر۔ میر معصوم کے ہاں یہ دونوں زاویے ایک شخصیت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی امتزاج ان کے ادبی مقام کو منفرد بناتا ہے۔ میر محمد معصوم بکھری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی سندھ سے وابستگی ہے۔ انہوں نے سندھ کو صرف اپنی جائے پیدائش یا رہائش کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اس کے ماضی، معاشرے، حکمرانوں، جغرافیے اور تہذیبی زندگی کو قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ "تاریخ معصومی" دراصل سندھ کی تاریخی شناخت کو محفوظ کرنے کی ایک بڑی کاوش ہے۔ اس کتاب میں سندھ کے مختلف تاریخی ادوار کے حالات محفوظ ہوئے۔ چچ نامہ کے بعد سندھ کی تاریخ کے حوالے سے "تاریخ معصومی" کو قدیم اور اہم تاریخی ماخذوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بعد کے مورخین نے سندھ کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ سمجھنے کے لیے اس سے استفادہ کیا۔ میر معصوم نے سندھ کے ان ادوار کو قلم بند کیا جن میں سیاسی اقتدار کی تبدیلیاں، ارغونی و ترخانی حکمرانوں کے حالات اور بالآخر مغلیہ اقتدار کا قیام شامل تھا۔ ان کی تحریر میں اس دور کے سندھ کی سیاسی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اہم مقامات اور شخصیات کی جھلکیاں بھی محفوظ ہیں۔ میر محمد معصوم کی سندھ کے لیے خدمات صرف کتاب اور شاعری تک محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے تعمیرات کے میدان میں بھی یادگار کام کیا۔ سکھر میں قائم تاریخی مینارِ معصوم ان کے نام سے وابستہ سب سے معروف یادگار ہے۔ یہ مینار آج بھی سندھ کے تاریخی فنِ تعمیر اور سکھر کی شناخت کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔

مینارِ معصوم کی تعمیر اس امر کی علامت ہے کہ میر معصوم علم و ادب کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر سے بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ سکھر کے تاریخی منظر نامے میں یہ مینار دریائے سندھ کے خطے کی قدیم تہذیبی اور فنِ تعمیر کی روایت کی یاد دلاتا ہے۔ یہ عمارت محض اینٹ اور پتھر کا ڈھانچہ نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی علمی و جمالیاتی سوچ کی علامت ہے جس نے اپنے عہد کے علم، فن اور تاریخ کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ آج بھی سکھر آنے والے افراد کے لیے مینارِ معصوم شہر کی تاریخی شناخت کا نمایاں نشان ہے۔

میر معصوم نے مغلیہ دور کے اہم واقعات کو بھی قریب سے

دیکھا۔ سندھ میں مغلیہ اقتدار کے قیام کے دوران وہ مغلیہ لشکر کے ساتھ موجود رہے۔ اس لیے "تاریخ معصومی" کے بعض حصے ایسے واقعات پر مشتمل ہیں جن کے بارے میں مصنف کو براہِ راست مشاہدے کا موقع حاصل ہوا۔ سندھ میں مرزا جانی بیگ اور مغلیہ اقتدار کے درمیان کشمکش کے حالات بھی ان کی کتاب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کی سیاسی تبدیلی سندھ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن مرحلہ تھی۔ میر معصوم نے ان واقعات کو قلم بند کر کے سندھ کے سیاسی انتقالِ اقتدار کی ایک اہم تاریخی شہادت محفوظ کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ "تاریخ معصومی" محض بادشاہوں اور جنگوں کی داستان نہیں بلکہ سندھ کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے کا ایک بنیادی ذریعہ ہے۔ اس میں اس خطے کے تاریخی حالات کی وہ تصویری جھلک ملتی ہے جو بعد کے محققین کے لیے نہایت قیمتی ثابت ہوئی۔ میر محمد معصوم بکھری کی شخصیت کا سب سے متاثر کن پہلو ان کی کثیر الجہتی ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں مورخ، شاعر، خطاط، کاتب، طبیب، سپاہی اور سفارت کار تھے۔ ان کے علمی سرمائے میں "تاریخ معصومی" کے علاوہ طب و مفردات اور دیگر تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے۔ فارسی شاعری کے دو دیوان اور رباعیات سے متعلق ان کی ادبی شناخت بھی ان کے علمی ذوق کا ثبوت ہے۔ ان کی خطاطی بھی اپنے عہد میں معروف تھی۔ کلاسیکی اسلامی تہذیب میں خطاطی کو محض لکھنے کا ہنر نہیں بلکہ ایک فن سمجھا جاتا تھا، اور میر معصوم اس فن کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی علمی شخصیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علم کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں۔

آج جب ہم سندھ کے تاریخی ورثے، ثقافتی شناخت اور علمی روایت کی بات کرتے ہیں تو میر محمد معصوم بکھری کا نام ناگزیر طور پر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے سندھ کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کیا، فارسی ادب میں اپنا مقام بنایا اور سکھر میں ایسی تعمیراتی یادگار چھوڑی جو صدیوں بعد بھی ان کی یاد دلاتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کے واقعات کو محض گزرتے ہوئے حالات کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ انہیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کی ذمہ داری محسوس کی۔ اسی لیے "تاریخ معصومی" آج بھی سندھ کی تاریخ کے طالب علم، محقق اور مورخ کے لیے اہم ماخذ ہے۔

میر معصوم بکھری کا ادبی پہلو بھی سندھ کی تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ ان کی فارسی شاعری اس زمانے کے علمی ماحول کی نمائندگی کرتی ہے، جبکہ ان کی تاریخ نگاری سندھ کے اجتماعی حافظے کو محفوظ کرتی ہے۔ ان کی شخصیت اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ سندھ ہمیشہ سے علم، ادب، تہذیب اور فنون کا زرخیز خطہ رہا ہے۔

آج کے دور میں میر محمد معصوم بکھری کی زندگی ہمارے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ علمی ذمہ داری، تاریخی شعور اور اپنی سرزمین سے وابستگی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ قومیں صرف عمارتوں سے نہیں بلکہ اپنے حافظۂ تاریخ، ادب اور علمی ورثے سے زندہ رہتی ہیں۔ میر معصوم نے سندھ کے لیے یہ تینوں چیزیں چھوڑیں پہلی تاریخ کی کتاب، دوسری شاعری کا سرمایہ اور تیسری تعمیرات کی یادگار ہے۔ سندھ کے اس عظیم علمی ورثے کو نئی نسل تک جدید ذرائع سے منتقل کیا جائے۔

"تاریخ معصومی" پر مزید تحقیقی کام، میر معصوم کی شاعری کی تدوین و تشریح، ان کی خطاطی اور تعمیراتی خدمات پر مطالعات اور مینارِ معصوم کے تحفظ کے اقدامات سندھ کے علمی و ثقافتی ورثے کو مزید اجاگر کر سکتے ہیں۔ سید میر محمد معصوم بکھری کا نام سندھ کی تاریخ میں اس لیے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ انہوں نے اپنے عہد کو قلم کے ذریعے محفوظ کیا۔ ان کی شاعری نے انسانی جذبات کو آواز دی، ان کی تاریخ نگاری نے سندھ کے ماضی کو محفوظ کیا اور ان کی تعمیرات نے ان کی یاد کو پتھر میں ڈھال دیا۔ وہ بیک وقت سندھ کے مورخ، فارسی ادب کے شاعر اور تہذیبی ورثے کے امین تھے۔ ان کا علمی و ادبی سرمایہ آج بھی سندھ کی شناخت، تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے کے لیے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

■

A Strong Defence for a Peaceful Pakistan
Strength, Diplomacy and Regional Stability

Syed Aamir Hussain

Every year, Pakistan observes Defence Day with profound respect, national pride and a renewed commitment to the defence and sovereignty of the country. Observed on September 6, the day recalls the events of 1965, when Pakistan faced a major military challenge and the nation, together with its Armed Forces, demonstrated remarkable courage, resilience and determination. Defence Day is therefore not merely a remembrance of a past conflict; it is a reflection of the enduring national spirit that has enabled Pakistan to protect its sovereignty in difficult circumstances.

The events of September 1965 occupy an important place in Pakistan's national history. When hostilities escalated, the Armed Forces of Pakistan confronted a numerically larger adversary with determination and professional resolve. Soldiers, sailors and airmen stood on the front lines, while civilians across the country demonstrated unity and solidarity. From the battlefields to the cities, the people of Pakistan expressed their support for the Armed Forces and displayed a collective determination to defend their homeland. The courage demonstrated during the 1965 war remains a source of inspiration for generations. The Pakistan Army defended the country's territorial frontiers, the Pakistan Air Force demonstrated operational capability in the skies, and the Pakistan Navy remained vigilant along the maritime front. The contribution of civilians was equally significant. The nation stood together at a moment when national unity was indispensable.

The war eventually came to an end through diplomatic efforts. The Tashkent Declaration, signed in January 1966 under Soviet mediation, brought the two sides back from the battlefield to the negotiating table. The experience demonstrated an important lesson: military preparedness and diplomatic engagement are not contradictory. A responsible state must possess the capacity to defend itself while simultaneously pursuing peaceful means for resolving disputes. For Pakistan, the memory of 1965 subsequently became part

of a broader national experience in which defence preparedness, technological development, professional military training and diplomatic engagement acquired increasing importance. Over the decades, Pakistan continued to face complex security challenges, but the central principle remained unchanged: the country's sovereignty and territorial integrity must be protected while peace should remain the preferred objective.

This spirit was again tested in May 2025, when tensions between Pakistan and India escalated into several days of military confrontation. India launched military strikes beginning on May 7, while Pakistan subsequently announced its response under Operation Bunyan-un-Marsoos. Pakistan stated that the operation targeted military installations and strategic assets in response to Indian attacks. The confrontation culminated in a ceasefire understanding on May 10 following intense diplomatic engagement.

The May 2025 confrontation demonstrated the dangers inherent in military escalation between two nuclear-armed neighbours. Pakistan's official position emphasized its right to self-defence under Article 51 of the United Nations Charter, while India presented its own account of the circumstances and objectives of its military actions. Independent reporting also documented significant military exchanges and the eventual ceasefire. For Pakistan, Operation Bunyan-un-Marsoos became a symbol of the country's determination to respond to aggression and safeguard its national sovereignty. According to Pakistan's military authorities, the operation engaged multiple military targets, while the government described the subsequent ceasefire as an opportunity to prevent further escalation. At the same time, the episode underscored a lesson of profound importance: in South Asia, military confrontation carries enormous risks, and responsible statecraft requires both credible defence and sustained diplomacy.

The significance of Defence Day, therefore, extends beyond battlefield narratives. It is ultimately about the people who make a nation resilient. The sacrifices of soldiers and civilians remind us that national security is not the responsibility of the Armed Forces alone. Economic strength, social cohesion, education, technological advancement, institutional stability and responsible citizenship are all essential components of national strength.

Pakistan's defence capabilities have evolved considerably since 1965. The country has invested in indigenous defence production, advanced aviation technology, missile capabilities, maritime security, cyber capabilities and modern surveillance systems. The development of indigenous platforms and increasing technological self-reliance demonstrate the importance of investing in national scientific and industrial capacity. A strong defence industry does not merely strengthen military preparedness; it also contributes to technological innovation, skilled employment and economic development. Yet, the ultimate objective of national strength should always be peace. Pakistan has repeatedly maintained that regional disputes should be resolved through dialogue, diplomacy and international law. A country that possesses the capacity to defend itself can approach diplomacy with greater confidence, but responsible leadership requires that such strength be used primarily as a deterrent rather than as an instrument of confrontation.

The agreement represents an important development in Pakistan's strategic relationships with two major Muslim countries. It reflects longstanding defence cooperation and growing coordination in an increasingly complex regional environment. Significantly, the three countries have also emphasized de-escalation and peaceful resolution of crises. Following the first meeting of the Strategic Political and Defence Committee in Istanbul

on August 31, 2026, Pakistan, Saudi Arabia and Türkiye agreed to establish a secretariat in Saudi Arabia and to strengthen cooperation in defence industries, technology development and joint production. Such developments demonstrate that contemporary national security is multidimensional. The security of a country depends not only upon tanks, aircraft, ships and missiles but also upon diplomacy, economic resilience, technological capability, energy security, food security, cyber preparedness and the strength of national institutions. Pakistan's future security will therefore depend on its ability to combine military preparedness with economic and technological progress.

Sindh has a special place in this national story. From the coastal waters of Karachi to the deserts of Thar, from the historic cities of Thatta and Hyderabad to the agricultural heartlands of interior Sindh, the province represents an important component of Pakistan's national identity and security. Its coastline gives Pakistan strategic maritime significance, while its people have historically demonstrated resilience, hospitality and a strong commitment to the country's unity. The national spirit of Defence Day therefore resonates deeply across Sindh.

The sacrifices of the Armed Forces and civilians should also encourage us to promote tolerance, unity and responsible citizenship. The strongest defence of a country is ultimately built upon the confidence of its people in their future. A prosperous economy, an educated population, effective institutions and social harmony reinforce the country's strategic strength just as surely as military preparedness. Defence Day is thus both a day of remembrance and a day of reflection. We remember the courage of those who stood in defence of Pakistan, honour the martyrs who sacrificed their lives, salute the veterans and serving personnel who continue to protect the nation, and acknowledge the families who

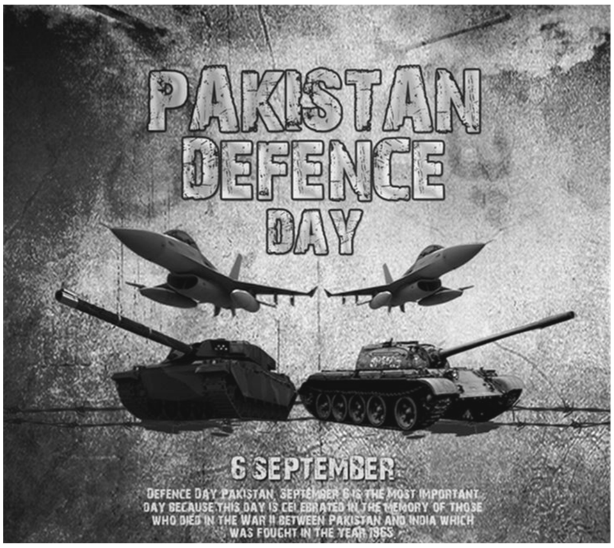

have carried the burden of sacrifice with dignity.

The Pakistan of today is different from the Pakistan of 1965, but the fundamental lesson remains the same: national unity, courage, preparedness and responsible leadership are indispensable to the security of the country. The experiences of the past, including the events of 1965 and the confrontation of May 2025, remind us that peace is strongest when it is supported by credible national strength.

Pakistan's commitment should therefore remain clear: to defend its sovereignty without compromise, to honour its martyrs without forgetting the value of peace, and to pursue regional stability through diplomacy, dialogue and cooperation. A strong Pakistan is not one that seeks conflict; it is one that possesses the confidence and capability to protect its people while extending the hand of peace.

On Defence Day, the nation pays tribute to all those who have defended Pakistan and renews its pledge to preserve the independence, sovereignty and territorial integrity of the country. May Pakistan continue to move forward as a peaceful, resilient, technologically capable and economically strong nation, contributing positively to regional and global stability .■

A New Era of Sustainable Mobility in Sindh Leading Sindh Towards Modern and Accessible Public Transport

Yusra Saleem

Public transport is one of the most important foundations of an inclusive, economically active and socially connected society. For millions of citizens, reliable transportation is not simply a means of travelling from one place to another; it is a vital link to education, employment, healthcare, markets and public services. Recognizing this importance, the Government of Sindh has continued to prioritize the expansion and modernization of public transport infrastructure across the province. Under the leadership of Senior Minister and Provincial Minister for Information, Transport and Mass Transit, Sharjeel Inam Memon, a number of initiatives are being pursued to make public transportation more accessible, efficient, affordable and responsive to the needs of citizens.

During the meeting, the Senior Minister was briefed on the ongoing operations of the Peoples Bus Service and plans for expanding the service to different cities of Sindh. One of the important developments discussed was the planned launch of Peoples Bus Service on the Qambar Shahdadkot–Larkana route. The buses for the route have already reached Larkana, while arrangements for the commencement of operations are being finalized. The initiative is expected to provide a more organized and convenient travel option for people travelling between these important cities.

The expansion of public transport beyond Karachi is particularly significant. Sindh's transportation requirements are not limited to its metropolitan centre. Citizens in Larkana, Qambar Shahdadkot, Mirpurkhas, Hyderabad, Sukkur and other districts also require safe, reliable and affordable mobility. A province-wide transport network can help reduce geographical disparities and support greater economic integration among different regions.

The approach adopted by Sharjeel Inam Memon reflects an understanding that public transport must evolve in accordance with changing public expectations. Modern buses, improved routes and new mobility options can contribute to a better quality of life while also supporting economic activity. His repeated emphasis on completing arrangements for new routes within stipulated timelines demonstrates a focus on implementation rather than merely planning.

Another important initiative under discussion is the introduction of double-decker buses. The arrival of such buses

represents an effort to enhance passenger capacity and introduce modern transport solutions suited to busy urban routes. Double-decker buses can potentially transport more passengers while making more efficient use of road space, particularly on routes where demand is high. Their introduction also adds a modern dimension to Sindh's public transport landscape.

The government is simultaneously working on the operational model for an Electric Vehicle Taxi Service. The transition towards electric mobility is increasingly becoming an important component of modern transportation policy worldwide. Electric vehicles can contribute to reduced dependence on conventional fuels and, depending on the electricity mix and operating conditions, help reduce emissions and urban air pollution.

For a province such as Sindh, where major urban centres face challenges related to traffic congestion, air quality and growing transportation demand, the development of electric mobility can become an important part of a cleaner and more sustainable transport system. The proposed EV Taxi Service therefore represents more than the introduction of a new category of vehicles; it reflects an effort to align public transport policy with emerging technological and environmental trends.

The government's transport agenda also places special emphasis on women's mobility. The Pink Scooties initiative is particularly noteworthy in this regard. Safe, affordable and convenient mobility can have a direct impact on women's access to education, employment, entrepreneurship and other opportunities. By facilitating independent transportation for women, such programmes can contribute to greater participation in the economic and social life of the province.

The planned expansion of Pink Scooties to Mirpurkhas is therefore an encouraging development. Extending such initiatives beyond Karachi demonstrates an understanding that women's mobility is a province-wide issue. Women in smaller cities and districts also require dependable means of transportation to pursue education, professional careers and economic activities.

The Sindh Government's Bus Rapid Transit initiatives represent another important dimension of the province's long-term transport strategy. BRT systems are designed to provide higher-capacity public transportation with improved operational efficiency and more organized passenger movement. When effectively integrated with conventional bus routes and other modes of transportation, mass transit systems can create a connected network rather than isolated transport corridors.

The progress reviewed during the meeting chaired by Sharjeel Inam Memon indicates that the government's approach is based on developing multiple layers of public transportation. Peoples Bus Service can serve regular urban and intercity passengers; BRT systems can provide high-capacity mass transit; EV taxis can offer flexible point-to-point mobility; double-decker buses can increase capacity on selected routes; and Pink Scooties can empower women through individual mobility.

Sharjeel Inam Memon's role in advancing these initiatives reflects a broader commitment to making transportation a public service that responds directly to citizens' needs. His direction that all arrangements for launching services on new routes should be completed on time conveys a clear message that government initiatives must translate into tangible facilities for the public.

The participation of senior officials, including Transport Secretary Asad Zamin, Trans Karachi CEO Zubair Channa, Sindh Mass Transit Authority Managing Director Aamir Behzad Memon and other relevant officers, further demonstrates the importance

being attached to coordination and institutional implementation. Successful transport projects require continuous collaboration among departments, authorities, technical teams and field staff.

The ultimate measure of any transport policy, however, is its impact on ordinary citizens. A successful public transport system should reduce travel difficulties, provide reasonable fares, improve safety, minimize waiting times and offer dependable services. It should also be accessible to women, students, elderly citizens and people with disabilities. These considerations are central to building a truly inclusive transportation system.

Sindh's transportation transformation is therefore not simply an infrastructure initiative. It is part of a broader vision of social and economic development. Better mobility can connect people with opportunities, strengthen commercial activity, facilitate tourism, improve access to education and healthcare, and contribute to more balanced development among different districts.

The continued expansion of the Peoples Bus Service, the planned introduction of double-decker buses, progress on EV Taxi Services, the Pink Scooties initiative and BRT development collectively present a promising picture of Sindh's evolving transport sector. These initiatives also demonstrate that modern public transport can combine affordability with innovation and accessibility with sustainability.

Under the leadership of Sharjeel Inam Memon, the Transport and Mass Transit Department is working towards translating this vision into practical services for the people. His emphasis on expanding routes, introducing new transport technologies, empowering women through mobility and ensuring timely implementation reflects a citizen-focused approach to public transportation.

A modern Sindh requires a modern transport system. As cities expand and population mobility increases, investment in efficient, safe and sustainable transportation will become even more important. The current initiatives provide an opportunity to build a transport network that not only meets today's needs but also prepares Sindh for the demands of tomorrow.

The Government of Sindh's continuing efforts in the transport sector deserve recognition for placing public mobility at the centre of development. The vision is clear: transportation should not remain a challenge for citizens; it should become an enabler of opportunity. With continued institutional commitment, effective implementation and public-oriented leadership, Sindh can move towards a future where every citizen has greater access to safe, affordable, modern and dignified transportation.

The progress under Senior Minister Sharjeel Inam Memon represents an important step in that direction. From expanding bus routes to embracing electric mobility and promoting women's independent transportation, the initiatives reflect a transport policy that seeks to connect people, empower communities and strengthen the social and economic fabric of Sindh. The journey towards a modern Sindh is, quite literally, a journey that begins with better mobility for all.■

I Work for Sindh
Empowering Sindh's Youth for a Digital Future

Parveen Baloch

The Government of Sindh's I Work for Sindh initiative represents an important and forward-looking effort to connect the province's young population with employment, skills development, modern education and the rapidly expanding digital economy. At a time when the nature of work is changing dramatically because of technology, artificial intelligence and global digital markets, initiatives that prepare young people not only to seek employment but also to become employable are essential for sustainable economic development.

The initiative has evolved beyond the traditional concept of a government employment portal. It is increasingly becoming a comprehensive digital career ecosystem where young people can discover employment opportunities, apply for jobs, develop new skills, access international courses and improve the way they present their professional capabilities to prospective employers. This broader approach reflects an important understanding: the challenge facing young people is not simply the availability of jobs, but also the ability to acquire the skills demanded by a changing labour market.

Senior Minister and Provincial Minister for Information, Transport and Mass Transit Sharjeel Inam Memon has highlighted the growing scale and impact of the initiative. According to the latest figures shared by him, the number of active employment opportunities available through I Work for Sindh has increased from 16,200 to 19,973. The number of registered candidates has reached approximately 121,000, while the number of jobs posted on the platform has risen from 23,400 to 26,890. These figures demonstrate the expanding reach of the platform and the increasing confidence of young people in digital mechanisms for accessing employment.

Perhaps even more significant is the number of applications submitted through the platform. More than 457,000 job applications have been received so far. This figure reflects a high level of participation by the youth of Sindh and demonstrates that young people are actively looking for opportunities through digital channels. It also indicates that there is considerable demand for structured employment platforms capable of bringing job seekers and employers together in an efficient and transparent manner.

The scale of participation gives I Work for Sindh a wider significance within the province's youth policy. Sindh has a large and diverse young population, including university graduates, technical students, skilled workers, professionals and young people seeking their first employment opportunity. Their needs are not identical. Some require access to vacancies, others need professional training, while many need guidance on how to compete in an increasingly sophisticated employment market.

The strength of the I Work for Sindh approach lies in attempting to address these different requirements within a single digital ecosystem. It recognises that employment and skills development must go hand in hand. A young person may find a job opportunity, but without the appropriate skills, professional presentation and technological competence, securing employment can remain difficult. Conversely, a young person who develops relevant skills but has no access to employers may also struggle to convert those skills into economic opportunity.

This is where the initiative's Learn and Earn component becomes particularly important. The number of young people completing courses under the programme has increased from 2,735 to 3,270. More than 1,200 international courses are also being used to prepare young people for the requirements of the global employment market. This is a significant shift from conventional employment policy because it focuses on developing human capital rather than merely facilitating job applications.

The global economy is increasingly driven by knowledge, technology and specialised skills. Employers are looking for candidates who can work with digital tools, understand emerging technologies, communicate effectively and adapt to changing professional requirements. Artificial intelligence, data analysis, digital marketing, software development, cybersecurity, e-commerce and remote working are creating opportunities that did not exist in the traditional employment environment.

For the youth of Sindh, this transformation presents both a challenge and an opportunity. The challenge is that conventional qualifications alone may no longer guarantee employment. The opportunity is that digital work can connect talented young people in Sindh with employers and clients across Pakistan and the world. A young person does not necessarily have to relocate to Karachi, Lahore or Islamabad—or even leave Pakistan—to participate in an international digital economy.

The Government of Sindh's emphasis on international courses is therefore particularly valuable. Exposure to globally relevant skills can enable young people to understand international professional standards and compete for opportunities beyond conventional local employment. If supported by reliable internet access, appropriate mentoring and continuous training, such programmes can contribute significantly to the development of a digitally capable workforce.

Another noteworthy feature is the introduction of an AI-powered Auto CV Creator. In the contemporary employment market, a curriculum vitae is often the first impression a candidate makes on a potential employer. Many capable young people, particularly those entering the workforce for the first time, struggle to present their qualifications and experience effectively. An AI-enabled CV creation facility can help them organise their educational background, skills and experience in a professional format.

The significance of such a facility extends beyond convenience. It introduces young people to the practical use of artificial intelligence in their professional lives. Instead

of viewing AI solely as a technological development, the initiative demonstrates how it can be used as a career-development tool. Young people can learn to use emerging technologies to improve productivity, communication and professional presentation.

The government's efforts should therefore be viewed within the broader context of economic transformation. Sindh's young population is one of its greatest assets. If equipped with relevant education, digital skills and access to employment, young people can become drivers of innovation, productivity and economic growth. If their potential remains untapped, however, unemployment and underemployment can become significant social and economic challenges.

The growing participation on I Work for Sindh provides an encouraging indication that young people are ready to engage with such opportunities. More than 121,000 registered candidates and over 457,000 applications represent not merely statistics but individual aspirations. Behind every application is a young person seeking a better career, a family hoping for economic stability and a potential professional waiting for an opportunity to demonstrate his or her capabilities.

The Government of Sindh deserves appreciation for recognising this aspiration and responding through a technology-driven employment and skills platform. The vision represented by I Work for Sindh goes beyond providing vacancies. It seeks to connect education, training, skills, technology and employment within one ecosystem.

The initiative also demonstrates the importance of modernising government services. Young people increasingly live in a digital environment and expect public institutions to provide services that are accessible, efficient and technology-enabled. A digital career platform brings government support closer to them and reduces dependence on traditional information channels.

The next phase should build upon this momentum by expanding partnerships with employers, increasing high-demand international courses, strengthening career counselling, developing district-level outreach programmes and introducing more advanced AI-based career tools. Regular monitoring of employment outcomes can further ensure that the platform remains focused on measurable results.

I Work for Sindh has the potential to become more than an employment portal. With continued political commitment, institutional support and private-sector participation, it can develop into a major provincial platform for youth empowerment and human-capital development. Its greatest achievement would be to create a generation of young Sindhis who are not only educated but skilled, digitally confident, professionally prepared and capable of competing in national and international markets.

The Government of Sindh's efforts in this direction deserve recognition. By bringing jobs, training, international learning opportunities and modern career tools onto a single platform, the initiative is helping transform the relationship between young people and employment. It reflects a shift from a narrow focus on vacancies towards a broader vision of employability, skills and economic empowerment.

The future of Sindh will depend substantially on how effectively it harnesses the energy, creativity and capabilities of its youth. I Work for Sindh is an important step towards that future. With sustained investment and continuous improvement, it can help turn young people's aspirations into careers, skills into livelihoods and digital opportunity into meaningful economic progress for Sindh.

■

Sindh's Enterprise Development Fund Empowering Youth in Mirpurkhas

Muhammad Asif Ahmed

SEDF Sindh Enterprise Development Fund
Investment Department
Government of Sindh

The Government of Sindh has taken an important and commendable step towards economic empowerment, employment generation and inclusive industrial development through its Enterprise Development Fund (EDF). The initiative demonstrates how targeted financial support, particularly interest-free loans, can transform individual skills into sustainable businesses, create employment and connect local production with international markets.

The experience of Mirpurkhas offers an encouraging example of this approach. Through interest-free financing under the EDF, young people have been supported in establishing textile and garment units, creating opportunities not only for themselves but also for hundreds of skilled workers.

What makes this initiative particularly significant is that its impact extends beyond local employment. Garments produced by these units are finding markets in Europe, the United States and other countries, connecting the skills of Sindh's workforce with the global economy.

Mirpurkhas has emerged as an important illustration of how small-scale industrial development can contribute to broader economic transformation. Around 45 small and large textile units have been established in the city, creating employment for hundreds of skilled artisans. These enterprises demonstrate that economic development does not necessarily depend exclusively on large industrial complexes. Small and medium enterprises, when supported with appropriate financing, training and market access, can become powerful engines of employment and local economic growth.

The EDF model is particularly relevant in a province such as Sindh, where a large young population represents both a tremendous opportunity and an important policy responsibility. Young people possess skills, creativity and entrepreneurial potential, but access to affordable capital is often one of the biggest barriers preventing them from

converting their abilities into viable businesses. Conventional commercial financing can be difficult for new entrepreneurs because of interest costs, collateral requirements and other financial conditions. Interest-free financing can therefore provide an important pathway for skilled individuals who have the ability to work but lack the capital required to establish an enterprise.

The textile sector provides an especially suitable platform for such intervention. Sindh has a long tradition of textile production, embroidery, tailoring, handicrafts and garment manufacturing. By combining traditional skills with modern production techniques and access to markets, local artisans can participate in value chains that extend well beyond their immediate communities.

The initiative also demonstrates the importance of linking local production with international markets. The export of garments manufactured in Mirpurkhas to Europe, the United States and other countries is an encouraging indication that products created by Sindh's skilled workforce can compete beyond domestic markets. Export-oriented production brings foreign exchange into the economy while creating incentives for businesses to improve quality, productivity, design and production standards.

For Sindh, developing export-oriented small and medium enterprises can be particularly important. Large-scale industries may require substantial capital and infrastructure, whereas smaller enterprises can often be established with comparatively modest investment and can generate employment relatively quickly.

If successful models are replicated across other districts, thousands of skilled people could potentially be brought into productive economic activity.

Another particularly commendable dimension of the Mirpurkhas initiative is the establishment of a Garments Section at Mirpurkhas Central Jail. This represents an innovative approach to rehabilitation and social reintegration. Providing incarcerated skilled workers with opportunities to use their abilities productively can help them earn an income and support their families while developing a sense of dignity, responsibility and purpose.

Vocational activity in correctional institutions is important because rehabilitation should extend beyond confinement. Prisoners who acquire or utilise practical skills can have better prospects of rebuilding their lives after release. Employment and financial independence can also reduce the social and economic pressures that may contribute to repeated offending. The garments section therefore represents not merely an employment project but a potentially valuable component of rehabilitation policy.

The opportunity for prisoner artisans to earn through their skills can also have a positive impact on their families. In many cases, imprisonment creates severe financial difficulties for households. Enabling skilled inmates to contribute economically can provide support to dependants while encouraging productive behaviour within the correctional environment.

Technology can further enhance the potential of these enterprises. Digital platforms allow small businesses to showcase products to customers around the world without depending exclusively on traditional intermediaries. Training young entrepreneurs in e-commerce, digital marketing, product photography, online customer management and international payments could significantly expand the reach of Sindh's small enterprises.

The textile units can also benefit from design innovation. International markets are highly competitive, and quality alone may not be sufficient. Contemporary designs, sustainable production, distinctive branding

and reliable delivery can help local manufacturers establish long-term relationships with international buyers.

The Government of Sindh deserves appreciation for recognising that economic empowerment requires more than financial assistance. The real objective is to create an environment in which individuals can turn skills into sustainable livelihoods. Interest-free loans provide the initial opportunity, but enterprise development, skills enhancement and market connectivity can make that opportunity sustainable.

There is also considerable potential for collaboration between government departments, chambers of commerce, exporters, financial institutions, universities, vocational training centres and private companies. Such partnerships can provide entrepreneurs with access to technical expertise, market information, modern machinery and international business networks.

Ultimately, the most important achievement of the Enterprise Development Fund is the change in perspective that it represents. Economic development is not simply about constructing infrastructure; it is also about investing in people. A skilled young person who receives the opportunity to establish a business can become an employer. A woman artisan who gains access to dignified work can strengthen her household. A prisoner who learns to earn through productive labour can begin the process of rehabilitation. A small textile unit that reaches an international buyer can become the foundation of a larger enterprise.

The Government of Sindh's efforts in Mirpurkhas deserve recognition because they demonstrate the practical value of combining finance, skills, employment, entrepreneurship and export development. The establishment of approximately 45 textile units, employment for hundreds of skilled workers, opportunities for women artisans and vocational engagement within the Central Jail collectively represent meaningful progress.

If this model is expanded thoughtfully across Sindh, it can contribute significantly to the province's economic transformation. More young people can become entrepreneurs, more women can enter dignified employment, more skilled workers can find sustainable livelihoods and more locally produced goods can reach international markets.

The Enterprise Development Fund therefore represents an investment not only in individual businesses but in Sindh's broader economic future. Its greatest success will be measured by the enterprises that survive and grow, the workers who gain stable employment, the families whose incomes improve and the products from Sindh that increasingly find their place in global markets.

With continued support, effective monitoring and expansion based on local potential, the Government of Sindh can turn the Mirpurkhas experience into a province-wide model of inclusive enterprise development. Such an approach can help build a Sindh where skills are valued, entrepreneurship is encouraged, women are economically empowered, young people have meaningful opportunities and local production contributes increasingly to national exports.

The progress achieved so far is encouraging. More importantly, it demonstrates what can happen when government policy is designed not merely to provide assistance, but to create opportunity, dignity and economic independence.

The Enterprise Development Fund has the potential to become one of the important instruments through which the Government of Sindh can translate its commitment to youth empowerment and economic development into tangible results for communities across the province.

■

سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید مراد علی شاہ نے ملیر میں عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جلوس میں شرکت کی۔ اس جلوس کا اہتمام دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ کے مفتی محمد جان نعیمی نے کیا۔ جلوس کے دوران صوبائی وزراء سعید غنی، ضیاء الحسن لنجار اور ریاض حسین شاہ شیرازی، میئر کراچی مرتضیٰ وہاب اور دیگر منتخب نمائندے بھی ان کے ہمراہ تھے۔

سندھ کے وزیرِ تعلیم سید سردار علی شاہ کی موجودگی میں اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سندھ، سنگاپور انٹرنیشنل ماسٹری کونٹیسٹس سینٹر (SIMCC) اور انٹرنیشنل کونٹیسٹس اینڈ اسیسمنٹس (ICA) کے نمائندوں نے مفاہمت کے ایک خط (LOU) پر دستخط کیے۔

MONTHLY IZHAR KARACHI

سندھ ایک تھا، ایک ہے اور ایک رہے گا

سندھ صرف نقشے پر کھینچی ہوئی ایک لکیر کا نام نہیں، یہ صدیوں کی تاریخ، محبت، تہذیب، زبان، ثقافت اور اپنے لوگوں کے جذبات سے جڑی ہوئی ایک زندہ شناخت ہے۔ دریائے سندھ کی روانی، شاہ لطیف کی شاعری، سچل کی صدا اور صوفیاء کی محبت اس دھرتی کے وجود میں رچی بسی ہے۔ سندھ کی وحدت دراصل اس کے عوام کے دلوں کی وحدت ہے، جسے کسی وقتی اختلاف یا سیاسی مصلحت سے کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سرزمین کے بیٹے اور بیٹیاں امن، بھائی چارے اور جمہوری اقدار کے ساتھ اپنے مستقبل کی تعمیر چاہتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ سندھ کی تاریخی شناخت، اجتماعی یکجہتی اور آئینی حقوق کا تحفظ کریں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سندھ چھوڑیں جو متحد، مضبوط، خوشحال اور ترقی یافتہ ہو۔